دامنِ باغباں

شات دلاویز افسانے

مُصنفہ

ڈاکٹر سعید احمد صاحب بریلوی

عصمت بُک ڈِپُو دھلی

سنہ ۱۹۴۲ء

قیمت ایک روپیہ

سلسلہ عصمت نمبر ۸۱

دامنِ باغباں

ڈاکٹر سعید احمد صاحب بریلوی

کے

افسانوں کا مجموعہ

جسے

رازق الخیری مالک عِصمت بُک ڈپو دہلی نے

دوسری مرتبہ سنہ ۱۹۴۲ء میں شائع کیا

مطبوعہ محبوب المطابع دہلی

اِس مجموعہ کے افسانے

نصیبن کا بیاہ

لکڑی کے ایک بڑے موٹے شہتیر کو آرے سے چیرتے چیرتے ہاتھ روک کر ایک آرہ کش نے دوسرے سے کہا:۔ "کیوں بھئی مولا بخش سال بھر میں تم نے کتنا روپیہ پیدا کیا"۔

مولا بخش (ہاتھ روک کر اور کسی قدر سوچ کر) "بھئی سب ملا کے کوئی ڈھائی سو روپے مشکل سے پیدا کئے ہوں گے"۔

پہلا شخص۔ "گھر والی زندہ ہے؟"

مولا بخش۔ "ہاں بھئی خدا کی مہربانی سے زندہ ہے"۔

پہلا شخص۔ "کوئی بال بچّہ بھی ہے؟"

مولا بخش۔ (کسی قدر خوشی اور فخر کے ساتھ) "خدا نے پانچ بچے دے رکھے ہیں"

پہلا۔ "اکٹھے پانچ! کیا سب لڑکے ہی لڑکے ہیں؟"

مولا بخش۔ "نہیں تو۔ تین لڑکیاں ہیں اور دو لڑکے"

پہلا۔ "ارے غضب خدا کا! تین لڑکیاں! بھئی مولا بخش یہ تو تم نے بہت بری خبر سنائی"۔

مولا بخش (تعجب سے) "اس میں بری کون سی بات ہے"

پہلا۔ "میرے یار ایک چھوڑ تین لڑکیاں لئے بیٹھا ہے اور کہتا ہے کہ اس

میں بُری کون سی بات ہے۔ لڑکیوں کا بیاہ نہیں کرنا پڑے گا۔ ایک ایک لڑکی پر ہزار ہی ہزار خرچ ہوئے، تب بھی تین ہزار کی رقم چاہیئے کہاں سے آئے گی"

مولابخش۔ "بھئی سچ کہتے ہو۔ میں نے تو کبھی اس بات کو سوچا ہی نہیں نصیبن تو اب اللہ رکھے بیاہنے کے لائق ہو گئی ہے۔ ماں کے پاس بیٹھی ہوتی ہے تو دونوں بہنیں بہنیں معلوم ہوتی ہیں۔ شب برات کے چاند سے پندرھویں برس میں لگی ہے"

پہلا۔ "لڑکی کی ذات بڑی جلدی بڑھتی ہے۔ پندرہ برس کا لڑکا ہوتا تو ابھی چھوٹا سا ہوتا۔ وہ اچھی خاصی جوان ہو گئی ہو گی"

مولابخش۔ کہا نہیں کہ ماں کے برابر کی معلوم ہوتی ہے۔

پہلا۔ "پھر کہیں سے رقعہ پیام کچھ آیا بھی یا نہیں"

مولابخش۔ "عید پر جب ہم ۲ دن کی چھٹی ٹھیکیدار سے لے کے گئے تھے تو نصیبن کی ماں کہتی تو تھی کہ کہیں سے کچھ بات آئی تھی۔ وہی کہتی تھی کہ لڑکا اچھا ہے کوئی بائیس ایک برس کا ہے۔ خوب گبرو جوان ہے اور میاں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پولیس میں نوکر ہے"

پہلا۔ "تو بات ٹھیر گئی؟ کب تک بیاہ کرنے کا ارادہ ہے؟

مولابخش۔ "ابھی ٹھیری تو نہیں، مگر ہاں مہینہ بیس روز میں ٹھیر جائیگی"

پہلا۔ "سب سامان ٹھیک ٹھاک کر لیا ہے۔ یا وقت کے وقت کرو گے"

مولابخش۔ ٹھیک ٹھاک کہاں سے کر لیتے۔ پندرہ بیس روپیہ مہینے کی

ہماری آمدنی۔ اس میں چھ سات کھانے والے کچھ بچتا تو ہے ہی نہیں“۔

پہلا۔ ”تو پھر کیا کروگے؟“

مولا بخش۔ ”کیا بتائیں کیا کریں گے۔ ہماری سمجھ میں تو کوئی بات آتی نہیں“۔

پہلا۔ ”کیا شربت کے پیالہ پر نکاح کر دینے کا ارادہ ہے“۔

مولا بخش۔ ”دیکھو بھئی اللہ مالک ہے“۔

پہلا۔ ”بہت سا روپیہ کمانے کی کوئی ترکیب سوچو، ایسے کام نہیں چلے گا۔“

مولا بخش۔ ”آرہ کشی کے سوا ہمیں کوئی اور کام نہیں آتا۔ اور اس میں جتنی آمدنی ہوتی ہے وہ تمہیں معلوم ہے“۔

پہلا۔ ”اگر تم تھوڑی سی ہمت کرلو تو ترکیب تو ہم بتادیں“۔

مولا بخش۔ ”(اشتیاق کے ساتھ) بتاؤ نا۔ پھر اور کس دن کام آؤ گے“۔

پہلا۔ اگر تم سچ مچ کرنے پر تیار ہو جاؤ تو بتادیں“۔

مولا بخش۔ ”نہیں کیوں کرینگے۔ یوں بھی تو ہم دن بھر محنت ہی کرتے ہیں“۔

پہلا۔ ”محنت تو اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔ خالی تھوڑی سی ہمت کی ضرورت ہے“۔

مولا بخش۔ ”تو بتاؤ بھی تو؟“

پہلا۔ ”تم شاید ہنسی سمجھوگے۔

مولا بخش۔ ”نہیں، جب تم ہنسی نہیں کر رہے ہو تو میں کیا ایسا پاگل ہوں کہ ہنسی سمجھونگا۔

پہلا۔ ”دیکھو بھئی مولا بخش لڑکی کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ وہ تم نے ذکر سنا ہوگا کہ ایک نواب صاحب نے اپنی بیٹی کے جہیز میں دنیا بھر کا سارا سامان دیا تھا اور بڑی بڑی قیمتی چیزیں دی تھیں۔ بس ایک تبنو کی میخیں دینی بھول گئے تھے۔ تو سارے زمانہ

میں ان کی بدنامی ہوگئی کہ لکڑی کی چار ہنڈیں تو دی ہی نہیں گئیں۔ دیا ہی کیا نواب صاحب نے۔ تو بھئی مولا بخش یہ معاملہ بڑا ٹیڑھا معلوم ہوتا ہے۔ بیٹی کے فرض سے اللہ خیریت کے ساتھ چھٹکارا کرا دے تو جانو کہ بڑی بات ہے، اولاد کی خاطر تو جانے آدمی کو کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔ اپنی اکیلی جان ہو تو چاہے بھوکے بھی پڑے رہو۔ تو کچھ پرواہ نہیں ہوتی۔ تمہارے ہاں اللہ کی دین ایسی ہوئی کہ ایک دم سے تین لڑکیاں دیدیں ابھی سے کچھ نہیں کرو گے تو وقت پر کچھ نہیں ہو سکیگا۔ ساری برادری میں ناک کٹ جائے گی"۔

مولا بخش۔ (کسیقدر متفکر ہوکر) "ہاں بھئی یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو بیٹی کا معاملہ ایسا ہی نازک ہوتا ہے۔ مگر اب وہ ترکیب تو بتاؤ"۔

پہلا۔ "تم بالکل تیار ہو؟"

مولا بخش۔ "یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟"۔

پہلا۔ (قریب آکر آہستہ سے) "بھئی تمہیں معلوم ہے کہ ٹھیکیدار صاحب اپنے گھر گئے ہوئے ہیں۔ اور پرسوں لوٹ کر آئیں گے۔ ہم لوگوں کی مزدوریاں دینے کے لئے وہ روپیہ بھی اپنے ساتھ لائیں گے اور کم سے کم دو ہزار روپیہ ان کے پاس ہوں گے اگر تم ہمت کرو تو ہم تم دونوں مل کر ان سے راستہ ہی میں روپیہ چھین لیں۔ نصیبن کا بیاہ بھی خوب دھوم سے ہو جائیگا اور ہمیں بھی تھوڑی بہت ضرورت ہے وہ بھی رفع ہو جائے گی اور میں یہ بھی بتا دوں کہ ٹھیکیدار صاحب کے پاس کوئی ہتھیار بھی نہیں ہے جو کچھ ڈر ہو"۔

مولا بخش (حیرت سے) "کیا تم سچ مچ یہ باتیں کہہ رہے ہو"۔

پہلا۔ "اور نہیں تو کیا جھوٹ موٹ کہہ رہا ہوں"۔

مولا بخش۔ (کانوں پر ہاتھ رکھ کر) "نا بھائی مجھ سے ایسا کام کبھی نہ ہوگا۔ نصیبن کا بیاہ ہو نہ ہو۔ اور برادری ہیں، ناک کٹے یا رہے ایسا کوئی کام تو نہیں کر سکتا"۔

پہلا۔ "کیوں اس میں تمہیں مشکل کیا معلوم ہوتی ہے؟"۔

مولا بخش۔ "آسان اور مشکل کا کیا ذکر ہے۔ ایمان اور خدا کا خوف بھی کوئی چیز ہے یا نہیں"۔

پہلا۔ "ایسے ہم لوگ کہاں کے پارسا ہیں۔ جہاں اور سینکڑوں گناہ کرتے ہیں وہاں ایک یہ بھی سہی اور پھر یہ تو تم ایک نیک کام کے لئے کرو گے۔ بیٹی کا نکاح کرنے کا تو خدا رسول نے حکم دیا ہے"۔

مولا بخش۔ "خدا اور رسول نے چوری کرنے اور ڈاکہ ڈالنے کی اجازت تو نہیں دی ہے"۔

پہلا (حقارت کے ساتھ) "تم ڈرتے ہو۔ بس اور کچھ بات نہیں ہے"۔

مولا بخش۔ "مجھے تو تم دنیا بھر کا ڈرپوک سمجھ لو۔ مگر یہ کام تو میں نہیں کرونگا"۔
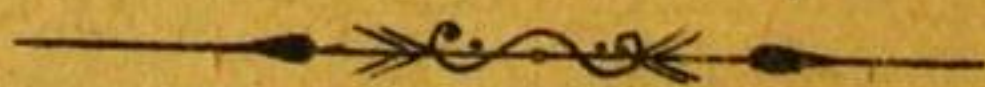
عبدالغنی ٹھیکیدار پیلی بھیت میں رہتے تھے۔ اور ایک مدت دراز سے انہوں نے یہی طریقہ اختیار کر رکھا تھا کہ سال کے سال جنگلوں کے ٹھیکے لے لیا کرتے تھے اور پھر انہیں کٹوا کر فروخت کر دیا کرتے تھے۔ ان ٹھیکوں میں انھیں خدا نے بہت کچھ دیا۔ اور اب وہ پیلی بھیت کے اچھے لوگوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ مولا بخش اور سیلوچ کے بیسیوں آرہ کش انہی کے جنگل میں کام کر رہے تھے۔ اور جیسا کہ مولا بخش کے ساتھی

نے جس کا نام بھولا تھا مولا بخش سے کہا تھا، وہ روپیہ لینے کی غرض سے پیلی بھیت گئے ہوئے تھے، وہ گذشتہ سال سے یہی کام کر رہے تھے اور آس پاس کے جنگلوں کا ایک ایک کونہ ان کا دیکھا ہوا تھا۔ قریب قریب کے دیہات کے بھی سب لوگ انہیں اچھی طرح جان گئے تھے۔ اور چونکہ وہ ایک بہت ہی نیک اور شریف آدمی تھے۔ اس لئے ہر شخص ان کی عزت کرتا تھا۔ پیلی بھیت پہنچکر عبدالغنی صاحب کسی قدر علیل ہو گئے۔ اس لئے اُنہوں نے خود جانے کی بجائے اپنے اکلوتے بیٹے عبدالمغنی کو روپیہ دیکر روانہ کر دیا تاکہ مزدوروں کو تکلیف نہ ہو۔ اور وقت پر وعدہ کے مطابق روپیہ انہیں مل جائے عبدالمغنی کی عمر کوئی تیئس ۲۳ سال کی تھی، وہ ایک نہایت حسین اور تندرست نوجوان تھا۔ اور اس سے پیشتر بھی اکثر موقعوں پر اپنے باپ کو اسی قسم کی مدد دیتا رہا تھا جس جنگل میں مغنی کو جانا تھا وہ ریلوے اسٹیشن سے تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر تھا۔ اگر گاڑی اپنے وقت پر آتی تو وہ پانچ بجے تک باسانی اپنی قیام گاہ پر پہنچ جاتا۔ لیکن کسی حادثہ کی وجہ سے گاڑی اپنے معمول سے تین گھنٹے دیر میں پہنچی اور گو مغنی کے دل میں ایک سے زیادہ مرتبہ یہ خیال آیا کہ رات کے وقت اتنا بہت سا روپیہ لیکر تن تنہا اسے جنگل میں نہ جانا چاہیئے۔ لیکن اس کی ہمت مردانہ نے اسے شرم دلائی اور وہ بلا تکلف اسی وقت چل پڑا۔

مغنی بھی جنگل کے رستوں سے اپنے باپ کی طرح خوب اچھی طرح واقف تھا۔ اور اندھیرا ہونے کے باوجود بالکل ایسی ہی آسانی کے ساتھ چلا جا رہا تھا گویا پیلی بھیت کی سڑکوں پر چل رہا ہے۔ ابھی بمشکل اس نے آدھا راستہ طے کیا ہوگا کہ یکایک اس کے دونوں طرف کے گھنے جنگل میں سے دو آدمی نکلے اور قبل

اس کے کہ وہ سنبھل سکے۔ ان دونوں نے پے در پے کئی لاٹھیاں ماریں۔ مغنی کی زبان سے "ارے یہ کون؟ ہائیں بھولا" کے الفاظ نکلے ہی تھے کہ بھولا کا ایک بھرپور ہاتھ اس کے سر پر پڑا اور وہ بالکل بے حس و حرکت ہو کر زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ مغنی کے زمین پر گرتے ہی جنگل سے آوازیں آنی شروع ہوئیں کہ کوئی اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا ہے کہ تم اس طرف سے راستہ روکو اور تم اس طرف سے اور پتوں کی کھڑکھڑاہٹ اور دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز نے بھولا اور اس کے ساتھی کو بدحواس کر دیا۔ اس نے مغنی کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ کاغذات کھینچنے شروع ہی کئے تھے کہ اسے معلوم ہوا کہ کوئی اس کے سر پر آ پہنچا ہے۔ اور مجبوراً اسے اپنی جان لیکر بھاگنا پڑا۔ نئے آنے والے کئی آدمی نہ تھے۔ بلکہ صرف مولابخش تھا جس نے محض اس غرض سے کئی نام لیکر انہیں حکم احکام دیئے تھے کہ ڈاکو خوف زدہ ہو جائیں۔ اور اس کی یہ تدبیر بہت ہی کارگر ثابت ہوئی۔ بھولا نے جب اس سے یہ کہا تھا کہ ٹھیکیدار کو راستہ میں لوٹ لینا چاہیئے، تو اُس وقت اُسے بھولا پر کچھ شک سا ہو گیا تھا۔ اور وہ برابر اس کے ارادوں کی ٹوہ لگاتا رہا اسے معلوم ہو چکا تھا کہ بھولا اور کلو دونوں یہ ارادہ کر چکے تھے کہ ٹھیکیدار کو لوٹیں گے۔ اس لیے اس نے بھی ارادہ کر لیا تھا کہ وہ ٹھیکیدار کی حفاظت کریگا جب وہ دونوں اپنی خوفناک مہم پر روانہ ہوئے تو مولابخش بھی نہایت خاموشی کے ساتھ ان کے پیچھے پیچھے چلا آیا اور انہیں علم ہوئے بغیر ایک جگہ چھپ کر بیٹھا رہا۔ مولابخش جب موقع واردات پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ٹھیکیدار کی بجائے ان کا لڑکا بیہوش پڑا ہوا ہے۔ اور بظاہر اس میں زندگی کے

آثار نہیں معلوم ہوتے۔ مولا بخش نے جھک کر نبض دیکھی تو چلتی ہوئی معلوم ہوئی اس نے جلدی جلدی اس کے گلے کے بٹن کھولے تاکہ کافی ہوا اس کے پھیپڑوں میں جا سکے۔ بٹن کھولتے وقت اس کا ہاتھ کاغذ کے بہت سے ٹکڑوں سے لگا جو غنی کے سینے پر بکھرے ہوئے تھے اور اسے معلوم ہوا کہ وہ سب نوٹ ہیں اس نے وہ سب اکٹھے کئے اور جیب میں سے باقی ماندہ نوٹ بھی نکالے اور دل میں خوش ہوا کہ وہ بچ گئے۔ اور بھولا کے ہاتھ نہ لگے۔

مولا بخش نے جب وہ سب نوٹ اپنے صلوکے کے پلے میں باندھے تو اسے خیال آیا کہ اگر میں ان نوٹوں کو اپنے پاس رکھ لوں تو کسی کو کیا خبر ہو گی، اور مجھے یہ بالکل اتفاق ہی سے مل بھی گئے ہیں۔ بھولا انہیں ضرور لے جاتا اگر میں اس کے سر پر نہ پہنچ جاتا۔ پھر اس میں کیا ہرج ہے اگر میں لے لوں (نوٹوں کو اچھی طرح ٹٹول کر) کم سے کم دو ہزار روپے کے ہوں گے۔ (خوشی اور اس کے ساتھ لالچ کی علامتیں اس کے چہرے پر نمودار ہوئیں) نصیبن کا بیاہ خوب دھوم سے ہو جائے گا۔ آرہ کشی سے اب میرا جی بھی اُکتا چلا ہے۔ کوئی چھوٹی موٹی دوکان کر لوں گا۔ بیوپ کے کاروبار میں بہت منافع ہے۔ بس اس کی تجارت کیا کرونگا۔ ایک ہزار روپیہ سے اچھا خاصا کام چل جائے گا۔ دن بھر کھڑے ہو کر آرہ چلانے سے تو نجات ملے گی .... مگر نہیں .... یہ تو کھلی ہوئی چوری اور بے ایمانی ہے۔ میں نے بیشک ڈاکہ نہیں ڈالا اور میں دراصل میں یہاں آیا بھی تھا ٹھیکیدار کی مدد کرنے کے لئے۔ مگر پھر بھی اس طرح اتفاق سے جو روپیہ میرے ہاتھ لگ گیا ہے میرا نہیں ہو سکتا۔ اور بلکہ تھوڑے سے نوٹ

تو ہیں نے اپنے ہاتھ سے مغنی میاں کی جیب میں سے نکالے ہیں۔
اس نے پھر ایک دفعہ نوٹوں کو ٹٹولا اور کانپ کر دل ہی دل میں کہنے لگا نہیں میں انہیں ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ خدا مغنی میاں کو اچھا کر دے مجھے کسی کا روپیہ نہیں چاہیئے۔ نصیبن کی تقدیر میں ہے تو اس کا بیاہ کسی نہ کسی طرح ہو ہی جائیگا۔ مجھے محنت سے بھی جی نہیں چرانا چاہیئے۔ اسی محنت کی بدولت میں اب تک اتنا تندرست ہوں۔ تھوڑے سے روپیوں کی خاطر کیا میں اپنا ایمان بیچدوں گا۔ اس نے ایک مضبوط ارادہ کے ساتھ پگڑی کے اس پلے کو جس میں نوٹ بندھے تھے پگڑی کے پیچوں میں اُڑس لیا اور اس کے بعد آہستگی کے ساتھ مغنی کی لاش کو اُٹھا کر تھانے پرے گیا۔ جو سٹیشن کے قریب ہی تھا۔ پیلی بھیت جانے والی گاڑی کا وقت بھی قریب تھا۔ اس لئے مغنی کو اسی طرح عالم بیہوشی میں پیلی بھیت کے ہسپتال میں پہنچا دیا گیا۔ اور مولا بخش نے جا کر عبدالغنی ٹھیکیدار کو اس حادثہ کی اطلاع دی عبدالغنی اپنی بیماری کو بھول گئے اور ان کے گھر بھر میں اس خبر سے کہرام مچ گیا۔ سینکڑوں ہزاروں سوالوں کے جواب دیتے دیتے مولا بخش بیچارہ پریشان ہو گیا۔ اور محض اس بدحواسی کی وجہ سے اُسے قطعاً خیال نہ آیا کہ وہ نوٹ جو اسے مغنی کی جیب میں سے ملے تھے واپس کر دے۔

مغنی کو ہسپتال میں پہنچکر تین روز کے بعد کسی قدر ہوش آیا۔ اور اب اس کی زندگی کی توقعات قائم ہو چلیں۔ پولیس نے مولا بخش کے بیان پر بھولا

اور کلو کو گرفتار کر لیا تھا۔ اور صرف انہی دو آدمیوں پر اکتفا نہیں کیا تھا۔ بلکہ اور بھی تین آدمیوں کو ناکردہ گناہ پکڑ کر حوالات میں بند کر دیا تھا۔ ہوش آنے پر جب مغنی کے بیانات لیئے گئے تو اس نے بھی یہی بیان کیا کہ اس پر دو شخصوں نے حملہ کیا تھا۔ اور ان کے نام بھی وہی بتائے جو مولا بخش نے بتائے تھے۔ لیکن اپنے کسی خاص مقصد کے لئے پولیس چاہتی تھی کہ ان تین آدمیوں کے نام بھی حملہ آوروں کی فہرست میں شامل ہو جائیں، جنہیں اس نے بطریق خود گرفتار کر لیا تھا۔ مغنی کو جب پولیس والوں نے سمجھایا تو وہ یہ کہدینے پر نیم راضی سا ہو گیا کہ علاوہ کلو اور بھولا کے دو تین آدمی اور بھی تھے۔ جنہیں وہ اچھی طرح نہ پہچان سکا۔ لیکن مولا بخش سے جب یہ کہا گیا کہ وہ دو کی بجائے پانچ آدمیوں کے نام بتائے تو اس نے جھوٹ بولنے سے صاف انکار کر دیا۔ ایک نوجوان کانسٹبل اس کام پر مقرر کیا گیا تھا کہ وہ کسی طرح مولا بخش کو راضی کرے۔ چنانچہ اس نے پہلے تو مولا بخش کو بہکانے کی کوشش کی۔ پھر پانچسو روپیہ نقد دینے کا وعدہ کیا اور آخر میں اسے یہ دھمکی دی کہ اگر اس نے ان تینوں آدمیوں کا نام نہ لیا تو انسپکٹر صاحب اسے قید کرا دیں گے۔ اور ملزموں سے یہ گواہی دلوا دی جائیگی کہ مولا بخش بھی ان کے ساتھ ڈاکہ ڈالنے میں شریک تھا۔ مولا بخش کے بار بار پوچھنے پر اس کانسٹبل نے جس کا نام فیاض تھا، مولا بخش کو بتایا کہ وہ تینوں شخص بہت مالدار ہیں اور مقدمہ میں پولیس کو کچھ روپیہ وصول ہونے کی انہی سے امید ہو سکتی ہے۔ اس جواب نے مولا بخش کو پولیس کی طرف سے سخت متنفر کر دیا۔ اور اس نے فیاض سے صاف صاف کہدیا کہ خواہ اسے جیل خانہ ہو جائے یا پھانسی دی جائے

لیکن وہ کسی بے گناہ کا جھوٹا نام ہرگز نہ لے گا۔

ایک ہفتہ بعد مغنی اسپتال سے اپنے گھر آگیا۔ ٹھیکیدار صاحب نے اس کی صحت کی خوشی میں جلسہ کیا اور اس میں مولا بخش کو بھی بلایا۔ اور دونوں باپ بیٹوں نے سچے دل سے اس کا شکریہ ادا کیا۔ مغنی نے اپنے احباب اور اعزا کو سُنانے کے لئے اس دن کے واقعات دوہرانے شروع کئے اور اثنائے تذکرہ میں جب نوٹوں کا ذکر آیا تو مولا بخش کو ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے اس کے دماغ میں جلتی ہوئی لوہے کی سلاخ چبھو دی۔ اسے یاد آیا کہ ابھی تک اس نے وہ نوٹ ٹھیکیدار کو واپس نہیں کئے تھے۔ اور ایک عالم بے اختیاری میں وہ اس جلسہ سے اُٹھ کر بھاگا۔ لوگوں کو اس حرکت پر تعجب اور شک بھی ہوا۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ کوئی غلط یا صحیح رائے قائم کر سکیں، مولا بخش اپنی میلی کچیلی پگڑی ہاتھ میں لئے آتا نظر پڑا۔ بڑی عاجزی کے ساتھ اس نے ٹھیکیدار سے یہ کہہ کر معافی مانگی کہ اس دن پریشانی اور بدحواسی میں وہ نوٹ واپس کرنا بھول گیا تھا اور چونکہ اس نے دوسرے دن صبح کو کپڑے بدل لئے تھے۔ اس لئے اس پگڑی کو بھی ہاتھ لگانے کی نوبت نہ آئی۔ کہ اسے اسی طرح خیال آجاتا۔ انتہائی خوشی اور حیرت کے ساتھ وہ نوٹ گنے گئے۔ تو معلوم ہوا کہ بالکل پورے ہیں۔ اور بھولا جو کچھ لے گیا تھا وہ نوٹ نہ تھے بلکہ کچھ اور کاغذات تھے۔ عبدالغنی اور عبدالمغنی کے دل پر مولا بخش کی اس ایمانداری کا بہت ہی بڑا اثر ہوا۔ اور اہل جلسہ میں سے اکثر لوگ اس فکر میں پڑ گئے کہ مولا بخش کو پاگل خیال کریں یا ایماندار۔ مولا بخش نے صاف صاف بیان کر دیا کہ جب وہ نوٹ اسے

مغنی کے سینہ پر پڑے ہوئے ملے تھے تو اس کے دل میں یہ لالچ آیا تھا
کہ انہیں اپنے قبضہ میں کرلے۔ اور نصیبن کے بیاہ کے کام میں لائے۔
لیکن کسی قدر فخر آلود تبسم کے ساتھ مولابخش نے کہا "خدا نے اس گناہ سے
مجھے بچالیا"

اِن حالات نے جلسہ کے اکثر شرکاء کو تعجب میں مبتلا کردیا۔ اور ان میں
سے بعض تو بہت ہی سنجیدگی کے ساتھ اس بات پہ غور کرنے لگے کہ آیا اس
زمانہ میں ایسے موقعوں پر اتنی ایمانداری ممکن ہے۔ عبدالغنی کی نگاہیں نہایت
تعظیم کے ساتھ مولابخش کی طرف کو اُٹھیں اور اس نے اُٹھ کر نہایت ادب کے
ساتھ ان نوٹوں میں سے ایک ہزار روپیہ کی رقم مولابخش کی خدمت کے صلہ
میں پیش کرنی چاہی۔ لیکن ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب مفلسانہ
اشتیاق کے ساتھ انہیں لینے کو دوڑنے کی بجائے مولابخش نے اس طرح
اپنے ہاتھ پاؤں سمیٹے کہ گویا وہ کوئی بہت ہی بُری چیز تھی۔ اور کہا کہ

"آپ امیر آدمی ہیں اور آپ کو یہی زیب دیتا ہے کہ اسی طرح غریب آدمیوں
کی مدد کیا کریں۔ مگر میں سچ کہتا ہوں کہ میں نے مغنی میاں کی حفاظت کا ارادہ
اس لئے نہیں کیا تھا کہ مجھے آپ سے کچھ مِل جائیگا۔ یوں بھی میں آپ ہی کا دیا
ہوا کھاتا ہوں۔ مجھے اس روپیہ کی ضرورت نہیں ہے"۔

ٹھیکیدار۔ مگر بھئی مولابخش یہ تو تمہیں لینا ہی ہوگا۔ یہ تو ہم خوشی سے
تمہیں دے رہے ہیں۔

مولابخش۔ ٹھیکیدار صاحب میں تو آپ سے بس اتنا ہی روپیہ لے سکتا

ہوں کہ جتنے کا آپ کا کام کروں۔ اس روپیہ کے لئے میں نے کوئی کام نہیں کیا ہے۔ اور یہ تو میں نہیں لونگا۔

مغنی اب تک حیرت اور تعظیم کی نگاہوں سے مولابخش کو دیکھ رہا تھا اور خاموش بیٹھا تھا۔ اب وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور بڑی منت کے ساتھ مولابخش کے سامنے جاکر بولا

مغنی۔ "چچا یہ روپیہ ہم آپ کو نہیں دے رہے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ آپ کی صاحبزادی کی شادی ہونے والی ہے۔ اور ابا جان کو اتنا حق تو ضرور ہے کہ اپنی بھتیجی کے لئے کوئی تحفہ دیں۔ آپ اس روپیہ کو شادی کے کام میں لایئے اور ابا جان کی طرف سے ایک حقیر تحفہ یا ہدیہ خیال کیجیے۔"

مولابخش نے کچھ سوچا اور تھوڑی دیر کے بعد آہستہ سے کہا۔

مولابخش: "میرے خیال میں اس روپیہ کی نصیبن سے زیادہ صغریٰ حقدار ہے آپ تو جانتے ہوں گے ہمارے محلہ میں مرزا فرحت بیگ رہتے تھے کوئی چھ برس ہوئے ان کا انتقال ہوگیا۔ اور ان کی بیوی نے نہ معلوم کیسی کیسی مصیبتوں سے صغرا کو پال کر اب بیاہ کے لائق کیا ہے۔ آپ کا تحفہ میرے سر آنکھوں پر میں سچے دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اور میں یہ رقم صغریٰ کی ماں کو دیدونگا۔ تاکہ وہ اپنی بیٹی کا بیاہ کر سکیں۔"

یہ کہہ کر اور نوٹ لیکر مولابخش جواب کا انتظار کئے بغیر وہاں سے چلدیا اور سب لوگ حیرت سے اسے دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ امیروں اور دولتمندوں کی سمجھ میں کسی طرح یہ بات نہ آتی تھی کہ دنیا میں کوئی شخص اور بالخصوص ایک غریب

شخص بھی اتنا سیر چشم ہو سکتا ہے۔ مجمع پر تھوڑی دیر خاموشی طاری رہی
اور تقریباً سب کی زبان سے بیک وقت یہی لفظ نکلے کہ "یہ شخص سچا مسلمان ہے۔
اب ایسے لوگ کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ گھر پہنچکر جب مولابخش نے بیوی سے
سب حال کہا تو قدرتی طور پر ماں کے دل میں یہی خواہش پیدا ہوئی کہ جو روپیہ
اس کی بیٹی کے نام سے ملا ہے وہ اسی کی بیٹی کے کام آئے۔ اس نے تھوڑی
دیر تک مولابخش کے ساتھ بحث کی۔ اور اسے اس بات پر رضامند کرنا چاہا
کہ خیر اگر سب نہیں تو اس میں سے نصف رقم ہی نصیبن کے لئے رکھ لے۔
لیکن جب مولابخش نے قطعی طور پر یہ کہدیا کہ چاہے نصیبن کا بیاہ ہو یا نہو
میں تو اب اس رقم میں سے اب ایک پیسہ بھی نہیں لے سکتا۔ جسے میں یہ
کہہ کر لایا ہوں کہ یہ صغریٰ کی شادی کے لئے ہے۔ تو مجبوراً مولابخش کی بیوی اٹھی
اور نہایت خوشی کے ساتھ وہ سب نوٹ صغریٰ کی ماں کو دے آئی۔

نصیبن خوبصورت بھی تھی اور چونکہ ماں باپ نے شروع ہی سے اسے پڑھنے
بٹھا دیا تھا۔ اس لئے کلام مجید کے علاوہ اس نے کچھ اردو کی کتابیں بھی پڑھ
لی تھیں۔ اور تھوڑا بہت حساب بھی جان گئی تھی۔ محلہ میں جو لڑکیوں کا مدرسہ
تھا اس میں چھٹی جماعت تک تعلیم دی جاتی تھی۔ اور اس مدرسہ سے وہ فارغ
التحصیل ہو کر نکل چکی تھی۔ خدا نے سمجھ بھی اچھی دی تھی اور اسے پڑھنے
کا شوق بھی تھا۔ اس لئے وہ ہمیشہ اپنے درجوں میں اچھے نمبروں سے پاس
ہوتی اور چھٹی جماعت کے آخری امتحان میں اس قدر اچھے نمبر حاصل کئے تھے

کہ زنانہ مدارس کی انسپکٹر صاحبہ نے اسے اپنی گھڑی انعام میں دی تھی۔ سوزن کاری میں غریبوں کی بچیاں یوں بھی ہوشیار ہوتی ہیں۔ اس لئے نصیبن اس کام میں بھی ید طولیٰ رکھتی تھی۔ یہی لڑکی اگر کسی کھاتے پیتے گھر میں ہوتی تو روزانہ صبح سے شام تک پچاسوں رقعے درخواستوں کے آیا کرتے۔ لیکن اسے کیا کہا جائے کہ آج دنیا میں غریب کی بات پوچھنے والا کوئی نہیں ہے۔ اور گو نصیبن کی صورت اور قابلیت بہت ہی سونے میں لدی ہوئی چربی کی مورتوں کے لئے باعث رشک تھی، پھر بھی اس وقت تک اس کے لئے صرف ایک ہی جگہ سے پیام آیا تھا۔ جسے اس کی ماں نے بلا تحقیق اور تفتیش کئے محض اس لئے منظور کر لیا تھا کہ اگر تحقیق کا نتیجہ لڑکے کے خلاف نکلا تو یہ بھی ہاتھ سے جائیگا۔ اور نصیبن کو عمر بھر کوئی خاوند کبھر میسر آئے یا نہ آئے۔ نصیبن کی عمر اگرچہ مولا بخش کو تو یہی خیال تھا کہ چودہ سال اور کچھ مہینے کی ہے۔ لیکن فی الحقیقت سولہ سے کچھ اوپر ہو چکی تھی، اور اس کی شادی کے متعلق ماں کو جس قدر فکر بھی ہوتی کم تھی۔ خلاف توقع اس حادثہ کی بدولت مولا بخش اس زمانہ میں گھر آیا ہوا تھا۔ اور چونکہ مقدمہ کی وجہ سے ابھی کچھ عرصہ تک پیلی بھیت ہی میں ٹھیرنا تھا اس لئے مغنی کے صحت یاب ہو جانے کے بعد جب مولا بخش کو ذرا اطمینان نصیب ہوا، تو ایک روز رات کو نصیبن کی ماں نے مولا بخش سے کہا:-

کریمن (نصیبن کی ماں) "اجی تمہیں لڑکی کی بھی کچھ فکر ہے کہ نہیں؟ تمہیں پیلی بھیت میں آئے اتنے دن ہو گئے۔ مگر نہ تو تم نے لڑکے کے متعلق کچھ پوچھ گچھ کی، اور نہ گھر ہی میں کوئی چیز بست لا کے ڈالی۔ تھوڑا تھوڑا کر کے ابھی سے کچھ

آتا رہے تو کچھ تو میں اپنے ہاتھ سے سیتی پروتی رہوں اور کچھ نصیبن سے سلوالوں۔ وقت کے وقت چیز بھی مہنگی ملے گی اور سینا پرونا بھی گھر میں نہ ہو سکے گا۔"

مولا بخش۔ "تم تو ایسی باتیں کرتی ہو، جیسے میں جان بوجھ کر کچھ نہیں کرتا۔ ابھی تک تو مغنی میاں کی وجہ سے فرصت ہی نہیں تھی۔ اب ذرا فرصت ہوئی ہے، اب سب کچھ کردوں گا۔ لڑکے کا تم نے کیا نام بتایا تھا؟"

کریمن۔ "فیاض"

مولا بخش۔ "کیا؟ فیاض! وہی کوئی بیس بائیس برس کا چھوکرا ذرا گورا گورا سا"

کریمن۔ "میں نے اسے دیکھا تو نہیں ہے۔ مگر چھوٹے کی ماں بھی یہی کہتی تھی کہ کوئی اکیس برس کا لڑکا ہے اور گورا گورا سا ہے۔ وہ پولیس میں نوکر ہے۔ کسی سپاہی سے پوچھ لوگے تو پتہ چل جائے گا۔

مولا بخش۔ ارے میں سمجھ گیا۔ میں اسے خوب جانتا ہوں، وہ تو روز آکے مجھے بہکایا کرتا تھا۔ اور مجھے دھمکی بھی دی تھی کہ اگر میں جھوٹی گواہی نہیں دونگا تو میرے اوپر مقدمہ قائم ہو جائے گا۔ میں ایسے بے ایمان کے ساتھ اپنی بیٹی کا بیاہ ہرگز نہیں کرونگا۔ وہ تو بڑا پاجی لڑکا ہے۔ ایک ایک منھ میں سو سو گالیاں بکتا ہے۔ توبہ توبہ بھلا اس کے ساتھ بے چاری نصیبن کا نباہ کیسے ہوگا۔ وہ تو اسے تکلیفیں دے دے کر چار ہی دن میں مار ڈالے گا۔ نا بھئی اگر وہی فیاض ہے تو میں ابھی سے کہے دیتا ہوں کہ نصیبن کا بیاہ چاہے ہو یا نہ ہو، میں ایسے بے ایمان اور نالائق لڑکے کو تو اپنا داماد ہرگز نہیں بناؤں گا۔"

کریمن کی تمام اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ اور وہ مایوسی کے عالم میں بہت دیر تک خاموش بیٹھی رہی۔ اور بہت دیر کے بعد بولی بھی تو یہ بولی۔ کہ

"پھر اب کیا ہو۔ لڑکوں کا تو نگوڑا ایسا کال پڑ گیا ہے کہ کہیں کوئی اچھا لڑکا ملتا ہی نہیں۔ لڑکی ہے کہ دن دونی رات سوائی بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اور اسے دیکھ دیکھ کے میرے دل پر ہول طاری ہوتا ہے۔ خدا خدا کر کے یہی ایک بات آئی تھی اور میں خوش ہو رہی تھی کہ اللہ نے سن لی، مگر اب تم کہتے ہو کہ وہ لڑکا بہت بُرا ہے۔ تم گھر پر رہتے نہیں۔ میں عورت ذات بھلا کیا انتظام کر سکتی ہوں!"

مولابخش:۔ "انتظام تو میں کچھ کر سکتا ہوں اور نہ تُم ہی کچھ کر سکتی ہو۔ اس لڑکے کو اگر میں نے پسند نہیں کیا تو تم ہی سوچو اس میں میری کیا غلطی ہے۔ اب میں آنکھیں دیکھتے مکھی کیسے نگل لوں۔ نصیبن کے لئے اگر کہیں سے پیام نہیں آتا تو نہ آئے۔ اب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ہم جانتے بوجھتے ایک ایسے بدمعاش کے حوالہ کر دیں۔ ایسے بیاہ سے تو وہ کنواری اچھی ہے۔"

کریمن:۔ "اے ہے خدا نہ کرے جو وہ کنواری رہے۔ تمہارے تو جو منہ میں آتا ہے کہہ بیٹھتے ہو۔ اب تم یہاں آئے ہوئے ہو تو دو چار جگہ اپنے ملنے والوں سے اور رشتہ داروں سے ذکر کرو اور اُن سے کہو کہ وہ تلاش کر کے کسی اچھی جگہ سے رقعہ بھجوا دیں۔"

مولابخش:۔ "اچھا دیکھو کل میں دو ایک آدمیوں سے ملوں گا۔"

صبح اُٹھ کر مولابخش اس ارادہ سے گھر سے نکلے کہ اپنے دو چار دوستوں

سے مل کر نصیبن کے متعلق تذکرہ کروں۔ لیکن اُدھر چند روز سے عبد الغنی ٹھیکیدار نے ان کی اس قدر خاطر اور تکریم و تواضع کرنی شروع کردی تھی کہ خود بخود سب سے پہلے وہ اسی طرف کو چل پڑے۔ جدھر عبد الغنی کا مکان تھا۔ آدھے سے زیادہ راستہ طے کر چکنے کے بعد انہیں خیال آیا بھی، مگر اب انھوں نے سوچا کہ پہلے ٹھیکیدار صاحب سے مل لیں۔ پھر کسی دوسری جگہ جائیں گے۔ حسب معمول عبد الغنی اور عبد المغنی نے آج بھی ان کی اچھی طرح خاطر تواضع کی۔ اور جب وہ اُٹھنے لگے تو عبد الغنی نے پوچھا کہ آج ایسی کیا جلدی ہے۔"

مولا بخش:۔ کیا بتائیں ٹھیکیدار صاحب یہ دنیا بہت بری جگہ ہے۔ ہماری نصیبن اب خدا رکھے جوان ہو چکی ہے۔ اور اس کی ماں کو رات دن یہی فکر لگی رہتی ہے کہ جلدی سے کہیں اس کا بیاہ ہو جائے۔ آپ جانیں ہم لوگ غریب آدمی ہیں اور مزدوری کرکے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ ہمارے پاس دینے لینے کو کچھ نہیں، اس لئے ہمارے گھر کوئی رقعہ پیام نہیں بھیجتا۔ ایک رقعہ آیا تھا اور نصیبن کی ماں راضی بھی ہو گئی تھیں۔ مگر وہ لڑکا پولیس میں نوکر ہے اور بہت ہی بے ایمان اور دغا باز ہے، میرا دل نہیں چاہتا کہ ایسی نیک اور بھولی بھالی لڑکی کو اس کے حوالے کردوں اور اپنے ہاتھ سے اپنی بیٹی کو بھاڑ میں جھونک دوں۔ اس لئے میں نے صاف انکار کردیا۔ اب لڑکی کی ماں میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے کہ جاکے اپنے دوستوں سے اور رشتہ داروں سے کہو کہ نصیبن کے لئے کوئی اچھا سا لڑکا تلاش کردیں اب اسی ارادہ سے نکلا ہوں کہ دو چار جگہ اس کا کچھ ذکر فکر کروں گا۔ اسی لئے تو اللہ میاں نے اولاد کو ہمارے لئے فتنہ بنایا ہے۔ اب اگر بے دیکھے بھالے اس

پولیس والے کے ساتھ کر دیتے تو تمہاری عاقبت خراب ہوتی کہ نہ ہوتی ؟"
عبدالغنی (ہمدردانہ انداز سے) "ہاں بھائی لڑکی کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے، عاقبت تو خراب ہوتی ہی ہے۔ دنیا میں بھی تو ساری عمر کا جلاپا ہو جاتا ہے۔"

مولا بخش حسب وعدہ اپنے کئی ملنے والوں کے پاس گئے۔ اور ان سب سے اس بات کا وعدہ لیکر دوپہر کے قریب گھر واپس آئے، اور بیوی کو اپنی کارگزاریوں کی اطلاع دی۔

کھانے سے فراغت پاکر مولا بخش اپنی چارپائی پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ اور نصیبن انہیں اپنے ہاتھ کے کاڑھے ہوئے اور سے ہوئے مختلف کپڑے دکھا رہی تھی کہ اتنے میں دروازہ سے ایک برقعہ پوش بڑھیا داخل ہوئی اور آتے ہی اس نے پوچھا کہ کیوں بیٹا کیا شیخ مولا بخش کا مکان یہی ہے۔"

مولا بخش ۔ "جی ہاں میرا ہی نام مولا بخش ہے۔ آپ کہاں سے آئی ہیں؟"
ضعیفہ ۔ (روکھی صورت بنا کر) بیٹا میں دکھیاری اپنا حال کیا بتاؤں۔ وہ کلو جس پر ڈاکہ کا مقدمہ چل رہا ہے۔ میرا بیٹا ہے۔ (رو کر) اتنی عمر آئی۔ اس نے کبھی ایسا کوئی کام نہیں کیا تھا۔ اب اللہ جانے کس نے بہکا دیا اور ایسا بہکایا کہ وہ اس کمبخت کے ساتھ ہو لیا اور پکڑا گیا۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ میرا بچہ بے قصور ہے۔ مگر بیٹا میں تم سے سچ کہتی ہوں کہ اسے چوری کرنے کی یا ڈاکہ ڈالنے کی عادت نہیں ہے۔ اور کبھی اس سے پہلے اس نے کسی کا ایک پیسہ بھی نہیں چرایا تھا میں نے سنا ہے کہ ٹھیکیدار صاحب سے تمہاری بہت ملاقات ہے اور اگر تم ان سے سفارش کر دو گے تو شاید وہ کوئی ایسی ترکیب نکالدیں کہ میرا کلو چھوٹ جائے۔

(رونے لگی)

مولا بخش۔ بڑی بی۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اگر میرے اختیار میں ہوتا، اور میری وجہ سے وہ پکڑا گیا ہوتا تو میں اُسے اُسی وقت چھوڑ دیتا۔ ٹھیکیدار صاحب بڑے اچھے اور نیک آدمی ہیں، اور میرے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آتے ہیں۔ مگر تم جانو میں دو پیسے کا مزدور ہوں، اور وہ خدا کے فضل سے روپیہ والے ہیں۔ میری ان کی ملاقات کیا اور اب میں ان سے کہوں بھی اور وہ مان بھی جائیں تو تم یہ تو سوچو کہ اُن کے اختیار ہی میں اب کیا ہے۔ اب تو مقدمہ کا چالان ہو گیا، اور وہ کیا کوئی بھی اب کچھ نہیں کر سکتا۔ اب تو عدالت ہی اگر تمہاری قسمت سے اسے چھوڑ دے تو وہ بچ سکتا ہے۔ نہیں تو اور کوئی صورت نہیں نکل سکتی۔

بڑھیا نے دو چار باتیں مقدمہ کے متعلق اور کیں اور پھر نصیبن کے سیئے ہوئے اور کاڑھے ہوئے کپڑوں کو دیکھ کر بہت کچھ تعریف کی نصیبن کو بہت سی دعائیں دیں اور آخر میں نصیبن کی ماں سے خوب دیر تک باتیں کر کے اور پان کھا کر رخصت ہو گئی۔ یوں تو ایک بڑھیا کے آنے اور چلے جانے میں کوئی خاص بات قابل خیال نہ ہو سکتی تھی، لیکن اس کا رونا کچھ ایسا مصنوعی سا تھا اور اس کے تمام رنج و غم کا یکایک دُور ہو جانا کچھ اس قدر عجیب تھا کہ مولا بخش نے اس کے جانے کے بعد بیوی سے کہا۔

مولا بخش۔ یہ عجیب طرح کا رونا تھا کہ دو منٹ میں سارا غم دور ہو گیا۔ اور ذرا سی دیر میں بڑی بی خوب ہنسنے اور بولنے لگیں۔ یا تو بیٹے کی محبت کا یہ زور تھا کہ بات پیچھے اور رونا پہلے۔ یا ایک لمحہ بھر کے بعد بیٹے کو ایسا بھول بیٹھیں کہ پھر اس کا

ذکر تک نہ آیا۔

کریمن۔ "مجھے تو ہرگز بھی کلو کی ماں نہیں معلوم ہوتی"۔

مولابخش۔ "تو پھر خواہ مخواہ یہاں آکر اس نے جھوٹ کیوں بولا؟"

کریمن۔ "اب میں کیا جانوں"

شام تک میاں بیوی میں کئی مرتبہ اسی بڑھیا کے متعلق باتیں ہوئیں اور کوئی کسی طرح نہ سمجھ سکا کہ اگر وہ کلو کی ماں نہ تھی تو کون تھی۔

مولابخش اپنے معمول کے مطابق دوسرے روز پھر ٹھیکیدار صاحب کے یہاں پہنچے اور مقدمہ کے متعلق حالات وغیرہ دریافت کرنے میں مصروف ہو گئے ٹھیکیدار صاحب کے یہاں مولابخش کے علاوہ ان کے کئی دوست بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ اور جب مقدمہ کے متعلق خوب باتیں ہو چکیں تو یکایک عبدالمغنی اپنی جگہ سے اُٹھ کر آیا۔ اور بہت ادب کے ساتھ مولابخش کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے کہا۔

مغنی۔ چچا صاحب! آپ نے میری جان بچائی ہے۔ اور اگر آج میں زندہ یہاں موجود ہوں تو اس کا باعث صرف آپ کی بروقت امداد ہے۔ اگر آپ اس طرح نہ پہنچ جاتے تو اول تو وہ دونوں بدمعاش مجھے لوٹ لینے کے بعد خود ہی جان سے مار ڈالتے، اور ہرگز اس وقت تک وہاں سے نہ جلتے جب تک کہ اس بات کا پورا اطمینان نہ ہو جاتا کہ میں مر چکا ہوں۔ اور اگر بفرض محال وہ اسی بیہوشی کی حالت میں چھوڑ کر چلے بھی جاتے، تب

بھی رات بھر اس جنگل میں اس طرح نیم مردہ حالت میں پڑا رہ کر میں کسی طرح زندہ نہ بچ سکتا تھا۔ میں خوب اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ میری زندگی دوبارہ ہوئی ہے۔ اور صرف آپ کی بدولت ہوئی ہے"۔

مولا بخش، بھیا تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ آخر بار بار انہیں باتوں کو دہرانے سے کیا فائدہ ہے، مجھے سچ مچ ان باتوں کو سُن کر شرم آتی ہے۔ میں نے آخر دنیا سے نرالی کون سی ایسی خدمت کی تھی، جس کا تم بار بار ذکر کیا کرتے ہو۔ جو کچھ میں نے کیا وہی ہر مسلمان کرتا۔ اور مسلمان پر ہی کیا منحصر ہے۔ ہر انسان کرتا"۔

مغنی:۔ (ہنس کر) "اگر آپ یہ کہتے کہ جو کچھ میں نے کیا وہی ہر مسلمان کو کرنا چاہیئے۔ تب تو بیشک میں مان لیتا۔ مگر اسے تو میں کیا کوئی بھی نہ ملنے گا کہ آج کل مسلمانوں میں اتنا ایمان، اتنی سچائی، اور اس قدر اخوت اور ہمدردی موجود ہے اگر یہی ہوتا تو پھر رونا کاہے کا تھا۔ جو کچھ آپ نے کہا وہ ہر انسان تو گیا معنی، ہر مسلمان بھی آج کل نہیں کیا کرتا۔ اور اس لیئے اس کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ لیکن اب جب کہ آپ نے میری جان بچائی ہے تو حقیقت میں ابا جان کی بجائے اب میں آپ کا بیٹا ہوں، اور میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ مجھے اپنی فرزندی میں قبول کر لیں"۔

ٹھیکیدار صاحب اور ان کے سب دوست چونک پڑے، اور غریب مولا بخش بالکل مبہوت ہو کر رہ گیا۔ لیکن صاحب عزم مغنی نے نہ باپ کی طرف دیکھا اور نہ ان کے احباب کی طرف۔ بلکہ اسی طرح اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری

رکھا اور کہا :۔

مغنی :۔ "آپ نے کل آبا جان سے کہا تھا کہ میں غریب آدمی ہوں۔ اور غریب آدمی کی بیٹی کے لئے کوئی رقعہ یا پیام نہیں بھیجتا۔ آپ نے کہا تھا کہ اس سبب سے آپ فکر مند رہتے ہیں۔ اور آپ نے کہا تھا کہ جو ایک پیام آپ کے یہاں آیا تھا، وہ ایک ایسے شخص کا تھا جسے آپ پسند نہیں کر سکتے تھے۔ میں یہ تمام باتیں سن رہا تھا، اور میں نے اسی وقت ارادہ کر لیا تھا کہ میں خود اپنا پیام اپنی زبان سے آپ کی خدمت میں عرض کروں اگر آپ ایک غریب آدمی ہو کر ایسی اسلامی دیانت داری، ایسی اسلامی حق گوئی اور ایسی اسلامی اخوت و ہمدردی کا ثبوت دے سکتے ہیں۔ تو مجھے بھی اجازت دیجئے کہ اسلامی احسان شناسی اور اسلامی مساوات کا نمونہ پیش کروں۔"

مغنی کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ یکایک مولا بخش بیچ میں بول اُٹھا

مولا بخش :۔ "نہیں مغنی میاں ایسا نہیں ہو سکتا۔ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نہیں لگایا جا سکتا۔ نصیبن ایک غریب آرہ کش کی بیٹی ہے۔ وہ ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ ان محلوں میں آ کر رہے۔"

مغنی ۔ "میں نے اچھی طرح اپنا اطمینان کر لیا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ اس کے قدموں سے ان مکانوں کی رونق بڑھ جائے گی۔ کل جو بڑی بی آپ کے یہاں گئی تھیں، وہ میری ایک رشتہ دار ہیں۔ اور ان کی معرفت مجھے سب حالات معلوم ہو چکے ہیں۔ آپ کے پاس دولت نہیں ہے۔ لیکن خدا

نے اسلام اور ایمان کی دولت سے آپ کو مالا مال کر رکھا ہے۔ روپیہ پیسہ ہمارے ہاتھ کا میل ہوتا ہے۔ غریب اور امیر کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا۔ بالکل ممکن ہے کہ کل کو آپ امیر ہو جائیں اور میں غریب۔ انسان کی اصل دولت اس کی انسانیت ہے۔ اور میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ یہ دولت آپ کے پاس مجھ سے بہت زیادہ ہے۔ آپ کو یہ میری درخواست منظور کرنی پڑیگی۔ (باپ سے مخاطب ہو کر) ابا جان آپ میری بے ادبی معاف کر دیجئے اور آپ بھی میرے لئے کوشش کیجئے۔ کیونکہ اگر چچا صاحب نے منظور نہ کیا۔ تو میں کبھی ہرگز خوش نہیں رہ سکتا۔ اور میری زندگی ہمیشہ کے لئے تلخ ہو جائے گی۔

عبدالغنی کچھ اس قدر محو حیرت تھے کہ انہیں گویا خبر ہی نہ تھی کہ کیا ہو رہا ہے۔ اب معنی کے اس کہنے پر وہ چونکے اور اٹھ کر مولا بخش کو گلے سے لگا لیا اور بولے

عبدالغنی - امیر، غریب، یا کالے اور گورے کا فرق اسلام میں کوئی چیز نہیں ہے اسلام میں صرف اچھے اور برے کا فرق ہے۔ مجھے فخر ہے کہ معنی اس فخر کو مٹانے کی کوشش کر رہا ہے جو غیر اسلامی ہے اور بھائی مولا بخش تمہیں اس کی درخواست منظور کرنا پڑے گی۔"

کمرہ میں تھوڑی دیر تک کامل خاموشی طاری رہی۔ اور اس کے بعد مولا بخش نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:۔

مولا بخش "- میں سمجھتا تھا کہ امیروں کے گھر سے اسلام رخصت ہو چکا ہے، مگر میرا خیال غلط نکلا۔ نصیبن ہرگز اس قابل نہ تھی کہ اس گھر میں قدم بھی رکھتی۔ مگر میں صرف اس لئے منظور کرتا ہوں کہ ایسے نیک لوگوں کے قدموں میں رہکر اس کی عاقبت درست ہو جائیگی"۔

خدا کا باغی

ممتاز اپنا بیلچہ اپنے سامنے رکھے ہوئے سر جھکائے خاموش
بیٹھا تھا۔ صبح چھ بجے سے اسے کام کرتے کرتے گیارہ بج چکے تھے، اور اب
وہ تھک کر بالکل چور ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ کے بہت سے اور قیدی
ذرا ذرا سی دیر کام کر کے مزے سے درختوں کے نیچے لیٹے ہوئے آرام کر
رہے تھے جیل کے سپاہی انہیں دیکھتے تھے، اور اس طرح مُنھ پھیر کر اُدھر
سے گذر جاتے تھے کہ گویا اُنھوں نے دیکھا ہی نہیں ہے۔ لیکن ہر ایک سپاہی
جب اس کے پاس آتا تو حالانکہ وہ برابر اپنا کام کرتا ہوا ملتا پھر بھی اسے
ٹوکا ضرور جاتا۔ اور اس ٹوکنے میں کبھی کبھی ایک آدھ گالی بھی نہایت
بے تکلفی سے استعمال کر لی جاتی تھی۔

ممتاز افسردہ اور ملول تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ قید میں تھا اور اسے
کئی کئی گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا۔ بلکہ اس لئے کہ وہ دیکھتا تھا کہ اسی کے ساتھ
کے وہ قیدی، جن کے رشتہ داروں اور دوستوں نے جیل کے محافظوں
کو کچھ تھوڑی بہت رشوت دے دی تھی، وہ بہت آرام سے رہتے تھے۔ نہ
انہیں کوئی کام کرنے پر ٹوکتا تھا۔ اور نہ ان پر ان گالیوں کی بوچھاڑ ہوتی تھی جو
باران رحمت کی طرح ہر وقت سپاہیوں کے منھ سے برستی رہتی تھیں۔ اس

کے برخلاف چونکہ نہ اس کا نہ کوئی دوست تھا اور نہ رشتہ دار، اس لئے
اس کی طرف سے کوئی رشوت سپاہیوں کو نہ پہنچتی تھی اور وہ کام بھی حد
سے زیادہ لیتے تھے۔ اور ہر وقت اسے طرح طرح سے ستاتے بھی رہتے تھے۔
غمگین، خاموش اور مضمحل ممتاز دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ یا اللہ
ان تمام دوسرے قیدیوں نے مجھ سے بہت زیادہ سنگین جرم کئے ہیں اور
ان میں سے کسی ایک کو بھی اپنے قصور پر ندامت یا پشیمانی نہیں ہے۔ لیکن
وہ اس قید کے زمانہ میں بھی کہ جو ان کی سزا کا زمانہ ہے، نہایت آرام
سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور میں نے حالانکہ کوئی ایسا سنگین قصور بھی
نہیں کیا ہے۔ اور سچے دل سے اپنی خطا پر نادم بھی ہوں۔ پھر بھی جو آتا
ہے، مجھے کو گالیاں دیتا آتا ہے۔ سب سے زیادہ محنت مجھ سے لی جاتی
ہے۔ اور سب سے زیادہ تکلیف مجھے پہنچائی جاتی ہے۔ اور یہ صرف
اس لئے کہ میرے پاس ان محافظوں کو دینے کے لئے روپیہ نہیں ہے
.... یہ کہاں کا انصاف ہے کہ میں سب سے زیادہ کام
کروں۔ اور سب سے زیادہ خوشی سے کام کروں۔ پھر بھی مجھی پر سب
سے زیادہ گالیاں پڑیں۔ اور مجھی کو سب سے زیادہ تکلیف دی جائے
میں نے بیشک چوری کی تھی اور مجھے افسوس ہے کہ میں نے کیوں ایسا
کیا۔ لیکن جس حالت میں میں نے چوری کی تھی۔ اس حالت میں شاید
ہر ایک انسان یہی کرتا۔ مجھ پر کڑاکے کے تین فاقے گذر چکے تھے۔ اور
دنیا میں مارے مارے پھرنے کے باوجود نہ کہیں کوئی کام ملا نہ روٹی کا

ٹکڑا- پھر ایسی حالت میں آخر میں کیا کرتا۔ میں ایک حلوائی کی دوکان سے مٹھائی چرا کر کھاتا ہوا بھاگا- اور اگر میری ٹانگوں کی طاقت زائل نہ ہو چکی ہوتی تو ہرگز کسی کے ہاتھ بھی نہ آتا۔ حالانکہ میں نے ایسی سخت بھوک کی حالت میں چوری کی تھی -لیکن میں اس غلطی پر پشیمان ہوں- اور نہایت خوشی کے ساتھ اس سزا کو بھگت رہا ہوں- جو مجھے دی گئی ہے۔ لیکن اس کے کیا معنی کہ مجھے سزا دینے کے لئے تو قانون بھی تھا اور انصاف بھی تھا سبھی کچھ تھا اور جن لوگوں کے ہاتھ میں قانون انصاف اور سزا ہے۔ ان کے لئے کوئی قانون نہیں ہے۔ میں روز اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں کہ بہت سے قیدی اپنے گھر سے بھی اچھا کھانا کھاتے ہیں- اور کسی قسم کی مشقّت نہیں کرتے -صرف اس لئے کہ انھوں نے قانون انصاف اور سزا کے محافظوں کو چاندی کے چند سکّے دے دیئے ہیں۔ غضب خدا کا! ان لوگوں کا کام مجھ سے کرایا جاتا ہے۔ اور مجھے مجبور کیا جاتا ہے کہ اپنے کام کے علاوہ ان کا کام بھی کر کے دوں۔ تب ذرا سی اُبلی ہوئی ترکاری اور آدھی مٹی آدھے آٹے کی دو روٹیاں نصیب ہوں۔ .... مجھے اگر اس سے بھی زیادہ تکلیف دی جاتی تو میں اسے خوشی سے برداشت کرتا اور یہ سمجھ کر مطمئن ہو جاتا کہ میں نے گناہ کیا تھا- اس کی سزا مجھے مل رہی ہے۔ لیکن یہ اسی وقت ہو سکتا تھا کہ جب میں یہ دیکھتا کہ مجھ میں اور دوسرے مجرموں میں کوئی فرق نہیں ہے- اور قانون کی نظر میں امیر اور غریب سب

یکساں ہیں۔ (گھونسا زمین پر مار کر) یہ دولت ہر جگہ لعنت ثابت ہوتی ہے!۔ دولت مند جرم بھی کرتا ہے تب بھی اس کی سزا سے بچ جاتا ہے۔ قانون اور انصاف کے محافظ بھی دولت کے آگے سر جھکا دیتے ہیں۔ اور دولت مند کے غلام بن جاتے ہیں!!

قانون! انصاف!!.......... کیا ان لفظوں کے کچھ معنی ہیں اور کیا انسانی جماعت اپنی مرضی اور اپنی خواہش کے مقابلہ میں ان چیزوں کی کچھ پرواہ کرتی ہے؟ بس دولت خدا ہے اور انسان (دانت پیس کر) یہی قانون اور انصاف کا نام لینے والا انسان اس خدا کا غلام ہے۔ بھیڑیئے۔ کتے۔ گدھے گھوڑے، غرضیکہ ذلیل سے ذلیل جانور بھی اس انسان سے اچھے ہیں۔ ہاں ہاں ضرور اچھے ہیں۔ ان میں غریب اور امیر کا فرق تو نہیں ہے۔ ان میں قانون کا نام لے کر ڈاکے ڈالنے والے تو نہیں ہیں.......... ان میں انصاف انصاف کہہ کر غریبوں کا گلا کاٹنے والے جلاّد تو نہیں پائے جاتے۔ بیشک! انسان بدترین مخلوقات ہے اور میں انسان کا دشمن ہوں۔ میں ہرگز ہرگز کسی انسان سے محبت نہیں کر سکتا۔ آج سے میرے دل میں کسی انسان کی عزت باقی نہیں رہی۔ میں اب ہر انسان کے سر کو زمین پر ٹھوکر مار کر ٹھوکروں سے اڑا دینے کے لئے تیار ہوں۔ میں اب یہ سزا بھگتنی نہیں چاہتا۔ جو انسانی قانون اور انصاف نے مجھے دی ہے...... (کچھ دیر سوچ کر) ہاں اب میں یہی کروں گا
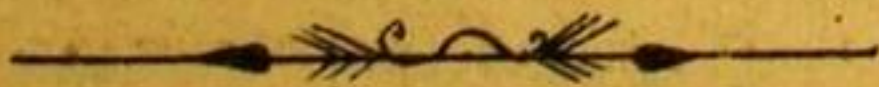
جیل سے فرار ہو کر ممتاز ان جنگلوں میں گھس گیا۔ جو کوہ ہمالیہ کے دامن میں کوسوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس میں اور جنگلی جانوروں میں بہت ہی تھوڑا سا فرق باقی رہگیا۔ اس کے سر کے بال صرف یہی نہیں کہ بڑھ گئے ہوں۔ بلکہ وہ اُلجھ الجھ کر اور ان میں خاک مٹی کانٹے اور تنکے وغیرہ پڑ پڑ کر نوکدار سنگینوں کی طرح اس کے سر پر کھڑے ہو گئے تھے۔ داڑھی نے بے ترتیبی اور بد نمائی کے ساتھ بڑھ کر تقریباً تمام چہرہ چھپا لیا تھا۔ اور مونچھوں کی درازی پورے طور پر اس کے منھ کی پردہ پوشی ہو گئی تھی۔ اس کا اچھا خاصہ گندمی رنگ اب ہر وقت کی دھوپ کے اثر سے سیاہ ہو گیا تھا۔ اور دھوپ گرد و غبار اور ہر وقت کی خراشوں کے اثر سے اس کی جلد بالکل کھرکھری اور نہایت ہی سخت ہو کر رہ گئی تھی۔ چہرہ کو بالوں ہی نے کیا کم ہیبت ناک بنا دیا تھا کہ اس پر آنکھوں کی سرخی نے اور بھی ستم ڈھایا اور اب وہ سچ مچ کا بن مانس بنا ہوا ایک روز شام کے قریب جنگل سے نکل کر میدان میں آیا۔ اس کی چال میں بہت کافی وحشیانہ پن آگیا اور وہ اپنے سایہ سے بھی بھڑکتا ہوا تیز قدمی سے سامنے کے گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ کہ اسے ایک طرف کو چند خیمے لگے ہوئے نظر آئے وہ بھوک سے بیتاب تھا اور اپنی ظاہری ہیبتناکی سے بالکل بے خبر اس لئے اس نے اسی طرف کا رُخ کیا۔ اور خیموں کے پاس پہنچ کر جس طرف سے کھانے کی خوشبو آ رہی تھی اُدھر پہنچا۔ اور کھانا پکانے

والے نوکر سے کہا کہ میں بھوکا ہوں۔ مجھے تھوڑی سی روٹی دے دو۔
نوکر چیخ مار کر اور ہانڈی اور روٹی سب چھوڑ کر بھاگا۔ اور جب اس کے چیخنے سے کئی ایک نوکر جمع ہو گئے تو سب نے مل کر ممتاز سے کہا کہ یہاں نہ ٹھیرو یہاں سے بھاگ جاؤ۔ کھانے کی خوشبو نے ممتاز کی بھوک کو اور بھی تیز کر دیا تھا۔ اور اگرچہ نوکر چاکر بہتیرا چیختے چلاتے رہے، پھر بھی اس نے جلدی سے جھپٹا مار کر ایک روٹی اٹھا ہی لی۔ اور وہاں سے ہٹتا ہوا بھاگا۔ ایک روٹی سے سیری تو کیا ہو سکتی تھی، اس کی بھوک کچھ اور بھی تیز ہو گئی۔ اور اب پھر اس نے گاؤں کا رُخ کیا۔ گاؤں میں داخل ہوتے ہوتے اسے رات ہو گئی اور اس نے یہ خیال کر کے کہ ابھی سب لوگ جاگتے ہوں گے، تھوڑی دیر انتظار کرنا مناسب سمجھا اور ایک کنوئیں کی من سے تکیہ لگا کر اپنے تھکے ہوئے پاؤں پھیلا دیئے۔ اور لیٹ گیا۔
تھکے ہوئے بدن کو اس طرح تھوڑا سا آرام ملا تو اسے نیند آگئی اور وہ بالکل غافل ہو کر سو گیا۔ اور سویا بھی ایسا کہ رات کے دو بجے کہیں جا کر اس کی آنکھ کھلی۔
وہ گھبرا کر اُٹھا تو بھوک اور کمزوری کی وجہ سے اسے چکر سا آیا اور سہارا لینے کے لئے اسے کنوئیں کی من پر جھک جانا پڑا۔ چکر دُور ہونے پر وہ بلا کسی ارادے کے ایک طرف کو چل پڑا۔ اور تھوڑی ہی دُور چلنے کے بعد جب اسے ایک چھوٹا سا کچا مکان، جس کی دیواریں

بھی نیچی ہی تھیں نظر آیا تو وہ بلا تکلف دیوار پر چڑھ کر مکان میں داخل ہوگیا۔

اندر پہنچکر اس نے دیکھا کہ مکان اگرچہ بہت چھوٹا سا ہے لیکن نہایت صاف اور ستھرا ہے۔ ہر چیز قرینے سے اپنی جگہ پر رکھی ہوئی ہے۔ اور کسی جگہ کوڑے کرکٹ کا نام تک نہیں ہے۔ ابھی وہ اس مکان کی غیر معمولی صفائی پر تعجب سا کر رہا تھا کہ یکایک اس کی نگاہ دالان میں گئی۔ اور اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب اس نے دیکھا کہ اس چھوٹے سے دالان میں ایک جانماز بچھی ہے اور اس پر دو عورتیں کھڑی ہوئی نماز پڑھ رہی ہیں۔ مکان میں داخل ہوتے وقت اُسے یقین کامل تھا کہ گھر میں سب سوتے پڑے ہونگے اس لئے اول تو اسی بات پر تعجب ہوا کہ مکان والے جاگ رہے ہے۔ اور پھر اس تعجب میں یہ دیکھ کر اور اضافہ ہو گیا کہ وہ نماز میں مصروف تھے کبھی بچپن میں ممتاز نے خدا اور رسول کا نام اور نماز اور روزے کا ذکر سُنا ضرور تھا۔ لیکن اب تو ایک مدت مدید گذر چکی تھی کہ کبھی اس نے کسی مذہبی انسان کی شکل بھی نہ دیکھی تھی۔ اس کے دماغ سے یہ تخیل ہی نکل چکا تھا کہ خدا بھی کوئی چیز ہے۔ جیل خانہ میں اس پر جیسی جیسی سختیاں کی گئیں اور جیسے جیسے ظلم روا رکھے گئے اُنھوں نے اسے اور بھی خدا سے منحرف کر دیا۔ اور اب مذہب اور نیکی دونوں لفظ اس کے نزدیک قطعًا بے معنی تھے۔

اس نے اچھی طرح اپنی آنکھیں ملیں اور پھر غور سے دیکھا، اور اُسے
یہی نظر آیا کہ دو عورتیں مصلے پر کھڑی ہیں۔ جن میں سے ایک عمر کے
لحاظ سے ماں معلوم ہوتی ہے اور دوسری بیٹی۔ ان کے چہروں پر
نور برس رہا تھا۔ اور ایک مرتبہ تو ممتاز کو ایسا معلوم ہوا کہ وہ مر چکا
ہے۔ اور جنت کی حوریں اس کے سامنے کھڑی ہیں۔ اس کا پتھر سے
بھی زیادہ سخت دل ایک لمحہ بھر کے لئے کچھ یوں ہی سا نرم ہوا، اور
ان نماز پڑھنے والیوں کی عظمت اس کی نگاہوں میں قائم ہو گئی
لیکن یہ سب کچھ صرف ایک لمحے کے لئے ہوا اور دوسرے لمحے میں پھر
اس کی وہی نفرت عود کر آئی جو اُسے انسانی نسل سے ہو گئی تھی۔
غصہ سے اس نے ان عورتوں کی طرف دیکھ کر دانت پیسے اور تیزی
سے قدم رکھتا ہوا آگے بڑھا۔ ماں اور بیٹی دونوں نے سلام پھیرا
اور حیرت اور خوف کے ساتھ اس اجنبی کو دیکھا جو ان کے مکان میں
گھس آیا تھا۔ پہلے تو بیٹی جھجک کر ماں کے پہلو سے چمٹ گئی، لیکن
پھر اس کے دل میں ہمت پیدا ہوئی۔ اور اس نے غصہ سے ڈانٹ
کر پوچھا "تم کون ہو اور کیوں ہمارے گھر میں گھس آئے ؟"
ممتاز:- "میں بھوکا ہوں روٹی کھانا چاہتا ہوں۔ مجھے تھوڑی سی
روٹی دے دو۔"

لڑکی نے ماں کی طرف دیکھا۔

ماں:- "بھائی اب تم آگئے ہو تو آرام سے بیٹھ جاؤ۔ جو کچھ روکھی سوکھی

ہمارے گھر میں ہے ابھی لاکر تمہارے سامنے رکھے دیتے ہیں۔

ممتاز کو ہرگز اس جواب کی توقع نہ تھی۔ اسے یقین تھا کہ اس کے سوال کے جواب میں نہایت غصہ اور حقارت کے ساتھ کہا جائیگا کہ ہمارے گھر سے نکل جاؤ۔ اور اگر یہی جواب ملتا تو وہ اپنے ہاتھوں سے اس کا جواب دینے کے لئے تیار تھا۔ لیکن تمام توقعات کے بالکل خلاف اور نسل انسانی کے اس عام برتاؤ کے بالکل برعکس کہ جس کا اُسے اب تک تجربہ ہوا تھا، ان عورتوں نے اسے بھائی کہہ کر پکارا اور اپنے گھر میں بٹھاکر کھانا کھلانے پر آمادہ ہوگئیں۔

کیا یہ انسانی نسل سے نہیں ہیں؟ کیا یہ حوریں یا پریاں ہیں؟ اس نے اپنے دل میں سوال کیا۔ اسے کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ ایک انسان کے دل میں بھی رحم اور ہمدردی کا مادہ ہو سکتا ہے۔ آخر اس نے کہا:۔

ممتاز ۔ (تیوری میں بل ڈال کر) "تم کو معلوم بھی ہے کہ میں کون ہوں میں ایک بڑا اچکا چور ہوں۔ اور ایک مدت تک جیل خانہ میں رہ کر بڑی مشکل سے وہاں سے بھاگا ہوں۔ میں تمہارے گھر میں بھی چوری ہی کرنے کے لئے آیا ہوں۔ اب بتاؤ کہ کیا تم اب بھی مجھے بھائی کہنے اور روٹی کھلانے کے لئے تیار ہو؟"

بوڑھی عورت ۔ "بھائی یا بیٹا تمہیں نہ کہوں تو اور پھر کیا کہوں؟ تم تو کہتے ہو کہ تم نے چوری کی تھی اور اس کی سزا بھگتی۔ اس سے مجھے کیا؟ تم مجھے یہ بتادو کہ وہ کونسا آدمی ہے جس نے کبھی کوئی گناہ نہیں کیا

ہے؟ - تمہارا گناہ لوگوں کو معلوم ہو گیا اور انہوں نے تمہیں جیل خانے میں ڈال دیا۔

میرے گناہ دنیا سے چھپے ہوئے ہیں اور صرف خدا کو معلوم ہیں اس لئے میں عزت دار بنی بیٹھی ہوں"۔

ممتاز (بات کاٹ کر) کیا کہا؟ کس کو معلوم ہیں؟ خدا کو؟ خدا کون؟"

نوجوان لڑکی۔" اے ہے غضب خدا کا! تم خدا کو نہیں جانتے؟"

ممتاز نے نگاہ اُٹھا کر لڑکی کی طرف دیکھا اور ایک لمحہ کے لئے پھر اس کے فولادی قلب میں خفیف سا گداز پیدا ہوا۔ لیکن پھر وہی خشونت عود کر آئی۔ اور اس نے کہا:۔

ممتاز۔ " تو تمہیں مجھ سے نفرت نہیں ہے؟ تم مجھے اس قابل سمجھتی ہو کہ اپنے پاس بٹھاؤ؟"

بوڑھی عورت۔" اوئی خدا نہ کرے! مجھے تم سے نفرت کیوں ہونے لگی تھی بیٹا۔ تم اگر آج برے ہو تو کل اچھے بن جاؤ گے۔ میں اللہ میاں کے کاموں پر اعتراض کرنے والی کون؟ میں تم سے نفرت کر کے کیا توبہ توبہ! اللہ میاں کے کاموں سے نفرت کروں گی؟ اب تم بیٹھ جاؤ خدا جانے کب کے بھوکے ہو۔ پہلے روٹی کھا لو۔ پھر تمہارا جی چاہے تو باتیں کر لینا"

(بیٹی سے مخاطب ہو کر) جاؤ بیٹی جمیلہ بھائی کو روٹی لا دو"۔

جمیلہ۔ ماں کے حکم کی تعمیل کے لئے ایک شعلۂ جوالا کی طرح اُٹھی۔ اور اس کے ساتھ ہی ممتاز کی نگاہیں۔ پھر ایک دفعہ اس نے غور سے

جمیلہ کو دیکھا اور دل میں کچھ گرمی اور نرمی سی محسوس کی۔ مگر صرف ایک لمحہ کے لئے۔ روٹی آئی۔ باجرے کی دو خوب موٹی موٹی روٹیاں اور سرسوں کا ساگ صاف ستھرے برتنوں میں اس کے سامنے رکھا گیا۔ اس نے کال کے مارے ہوئے فاقہ کشوں کی طرح جلدی جلدی روٹی کو منھ میں بھرنا اور نگلنا شروع کیا۔ قلعی کئے ہوئے صاف کٹورے میں پانی رکھا تھا۔ کھانے پینے سے فارغ ہو کر اس نے اطمینان کا ایک سانس لیا۔ اور پوچھا

ممتاز۔ "تم کون ہو؟"

بوڑھی۔ "بیٹا ہم بھی اوروں کی طرح اللہ کے گنہگار بندے ہیں۔ اسی گاؤں میں رہتے ہیں۔ اس بچی کا باپ دو برس ہوئے کہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ ہماری تھوڑی بہت زمین ہے۔ وہ ہم نے دوسروں کو جوتنے بونے کے لئے دے رکھی ہے۔ اسی میں سے خدا اتنا دے دیتا ہے کہ ہم دونوں اچھی طرح پیٹ بھر کر دونوں وقت کھا لیتے ہیں۔"

ممتاز۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ تم نے میرے ساتھ اتنی مہربانی کیوں کی اور دوسروں کی طرح تمہارے دل میں مجھ سے نفرت کیوں پیدا ہوئی۔"

بوڑھی۔ "بھیا اب میں کیا جانوں۔ میں نے تو یہ سن رکھا ہے کہ اللہ میاں کو اپنے بندے بہت پیارے ہیں۔ اور جو ان کے بندوں کی خدمت اور ان سے محبت کرتا ہے اسی سے وہ خوش ہوتے ہیں"۔..

"کیا خدا کے بندے بھی اس قابل ہیں کہ ان سے کوئی محبت کرے؟

ہرگز نہیں! کبھی نہیں! تم جھوٹی ہو۔ غلط کہتی ہو۔ میں تمہارے یہاں نہیں بیٹھوں گا۔ کمبخت، ناپاک ملعون انسان!...... نہیں ہرگز نہیں! سب کے سب گولی مار دینے کے لائق ہیں"۔.........

اسی طرح بکتا ہوا اور انسانوں کو گالیاں دیتا ہوا ممتاز اپنے میزبانوں کے گھر سے نکلا اور ایک طرف کو چل دیا۔
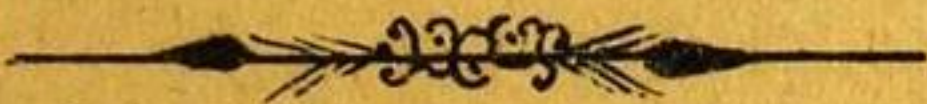
یکہ و تنہا اور خستہ و نزار، خدا جانے کہاں کہاں کی خاک اڑاتا ہوا ممتاز ایک روز ایک گاؤں کے قریب جا نکلا جو دریائے ساروا کے کنارے آباد تھا۔ گرمی کا موسم تھا دن بھر کی تیز اور چلچلاتی ہوئی دھوپ کے بعد شام کے وقت کی خنک اور خوش گوار ہوا نے اس کے مضمحل اعضا میں ایک جان سی ڈال دی۔ اور وہ بالکل بے فکری سے دنیا و مافیہا سے بے خبر دریا کنارے کنارے ٹہلتا چلا جا رہا تھا۔ کہ یکایک اس نے دیکھا کہ اس کے بالکل سامنے ایک بڑا بھاری میلہ لگا ہوا ہے۔ مرد عورتیں بوڑھے بچے سب رنگ برنگی پوشاکیں پہنے دریا کے کنارے پھر رہے ہیں۔ اور بہت سے اپنے کپڑے اتار کر اور دھوتیاں باندھ کر دریا میں تیرنے اور غسل کرنے میں مصروف ہیں۔ انسانوں کا اتنا بڑا مجمع دیکھ کر اسے وحشت بھی ہوئی اور اس کی طرف سے نفرت بھی پیدا ہوئی۔ وہ رُکا اور رُک کر تھوڑی دیر تک تو غصہ اور نفرت کی نگاہوں سے اس مجمع کو دیکھتا رہا اور پھر ادھر سے نظر ہٹا کر ان لوگوں کی خوش فعلیوں کا تماشا کرنے لگا۔ جو دریا میں نہا رہے تھے

بار بار اسے اپنے دل میں یہ خواہش محسوس ہو رہی تھی کہ برسوں کے بعد آج تو وہ خود بھی دریا میں گھس کر نہالے اور اپنے جسم سے اس میل اور غلاظت کو دور کرے جو مدت ہا مدت سے جمع تھی۔ آہستہ آہستہ یہ خواہش اس کے دل پر غلبہ پانے لگی۔ اور بالآخر اس نے اپنے کپڑے اُتار کر ایک پتھر کے پاس رکھے اور نہانے کے لئے دریا میں گھس گیا۔ مدتوں کا جما ہوا میل پھول پھول کر چھوٹنا شروع ہوا اور پانی کی خوشگوار خنکی نے آہستہ آہستہ اس کے دماغ کو فرحت پہنچا کر اس کے ماتھے کی وہ شکنیں دُور کر دیں جو مدتوں سے ہر وقت اس کے چہرے پر نظر آیا کرتی تھیں۔ دھل دُھلا کر اس کا بدن کسی قدر صاف بھی نکل آیا۔ اور کچھ اس قدر ہلکا معلوم ہونے لگا۔ کہ وہ بے اختیار گہرے پانی میں گھس کر اور خوب مزے لے لے کر تیرنے لگا۔

ابھی زیادہ دیر نہیں گذری تھی کہ یکایک کنارے کے آدمیوں میں ایک ہیبت ناک شور وغل پیدا ہوا۔ گھبرا گھبرا کر لوگ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر دوڑنے لگے۔ عورتوں نے چیخ کر رونا شروع کیا اور ممتاز نے دیکھا کہ اس سے تھوڑے فاصلہ پر ایک انسانی بچہ سارداکی تیز رو موجوں میں اس طرح بہتا ہوا اچھلا جا رہا ہے کہ جیسے تیز ہوا میں کٹی ہوئی پتنگ جاتی ہے۔ ایک عالم بے اختیاری میں کسی فوری اور ناگہانی جذبہ کے ماتحت ممتاز کے قوی اور مضبوط ہاتھ انتہائی تیزی کے ساتھ ملاحی لگانے لگے۔ اور غیر ارادی طور پر اس کا رُخ اس ڈوبنے ہوئے بچہ کی طرف ہوگیا۔

پانی کے سینہ کو چیرتا اور موجوں سے کشتیاں لڑتا ہوا ممتاز بچہ کے پیچھے چلا جارہا تھا۔ کہ وہ یکایک اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اس نے اب اپنی تیزی اور بھی زیادہ کی اور جب اپنے انداز سے یہ سمجھا کہ اب بچہ بالکل قریب ہوگا تو اس نے غوطہ مارا اور اندر ہی اندر تھوڑی دیر تلاش کرنے کے بعد جب بچہ کی لاش اس کے ہاتھ آئی تو وہ اُسے سینہ سے لگائے ہوئے اوپر اُبھرا اور کنارے کا رُخ کیا۔

لوگ خوشی سے چلّا رہے تھے۔ ہر طرف سے اس کی تعریفوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ اور شاباش اور صد آفریں کی صداؤں سے تمام فضا گونج رہی تھی۔ ممتاز ابھی تک اپنی اسی بے خبری کے عالم میں تھا۔ بچہ اس کی چھاتی سے اسی طرح لگا ہوا تھا۔ چھوٹے سے جسم کی ہلکی ہلکی گرمی برابر اسے محسوس ہو رہی تھی۔ اور ننھے سے قلب کی کمزور دھڑکن کو برابر اس کا دِل سُن رہا تھا۔ اور ان دونوں چیزوں کا متفقہ اثر اس پر یہ ہوا کہ جب وہ کنارے کے قریب پہنچکر تیرنے کی بجائے چلنے لگا، تو اس نے نہ معلوم دل کی کس خواہش سے مجبور ہو کر خوب زور سے بچّہ کو بھینچکر پیار کیا اور پانی سے باہر نکل کر اسے اس کی مضطرب اور بے قرار ماں کی گود میں دے دیا۔

لوگ اس بچہ کے علاج میں مصروف ہوئے اور ممتاز اپنے کپڑے پہن کر وہاں سے اس طرح چل دیا کہ گویا اس نے کوئی چوری کی تھی۔ آدمیوں سے بھاگ کر اور ان کی نظروں سے بچ کر وہ قریب کے جنگل میں داخل ہو گیا۔ اور نہایت تیزی سے ان تمام راستوں سے دُور ہو گیا۔ جن پر وہ

سمجھتا تھا کہ گاؤں کے لوگوں کا آنا جانا ناممکن ہے۔

جنگل کے تمام راستے اور اس کا چپّہ چپّہ اس کا دیکھا ہوا تھا۔ اس لئے وہ نہایت بے تکلفی اور بے باکی سے چلا جا رہا تھا۔ لیکن اب اس کا دل و دماغ ایک بہت ہی گہری فکر میں مبتلا تھے۔ انسانی نفرت کی موجیں بار بار اُٹھ کر اس کے دل میں تلاطم پیدا کرتی تھیں اور رہ رہ کر وہ اپنے آپ کو ملامت کرتا تھا کہ میں نے کیوں اس انسان زادہ کو بچایا مجھے تو یہ چاہیئے تھا کہ اور جتنے کمبخت وہاں کنارے پر کھڑے تھے ان سب کو بھی دھکے دے دے کر دریا میں ڈبو دیتا۔ لیکن ہر مرتبہ اس خیال کے ساتھ ایک بڑھی عورت اور اس کی خوروش بیٹی کی تصویریں اس کی نگاہوں کے سامنے آجاتی تھیں۔ اور یہ الفاظ اس کے کانوں میں گونج جاتے تھے کہ "خدا اپنے اُنہی بندوں سے محبت کرتا ہے جو اس کے بندوں سے محبت اور ان کی خدمت کریں۔"

"کیا خدا اس وقت مجھ سے خوش ہوا ہوگا؟ کیا میں نے اس کے ایک بندہ کی خدمت کی ہے؟ میں آج اس قدر خوش کیوں ہوں؟ میرے دل میں یہ مسرّت اور یہ تازگی کیسی ہے؟ کیا خدا نے میری خدمت کا یہ انعام دیا ہے؟ اُونھ! کیسا خدا اور کیسا انعام! یہ سب فضول خیالات ہیں۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ اس بڈھی نے کیا کہا تھا، یہی نا کہ اگر ہم آدمی سے نفرت کرتے ہیں، تو آدمی چونکہ خدا کی صنعت اور خدا کے ہاتھ کا کام ہے۔ اس لئے گویا ہم خدا سے نفرت کرتے ہیں۔ بڈھی نے بات تو سچی کہی تھی۔ انسان ظلم کرتا ہے تو ظلم اس

کا کام ہے۔ اس سے ہمیں نفرت کرنی چاہئے۔ انسان چوری کرتا
ہے تو چوری اس کا کام ہے۔ اس کو ہمیں بُرا سمجھنا چاہئے۔ لیکن چوری
تو میں نے بھی کی تھی۔ آہ! وہ جیل خانہ کی سختیاں! وہ ظلم! یہ کمبخت
انسان کس قدر بُرے ہوتے ہیں! مجھے میرے گناہ کی سزا ملی تھی
مگر لوگوں نے مجھ سے نفرت کرنی شروع کردی۔ انہیں میری چوری سے
نفرت نہ تھی۔ بلکہ مجھ سے نفرت تھی۔ لوگوں نے کس قدر غلطی کی، مگر
وہی غلطی تو میں بھی اب کر رہا ہوں۔ میں انسانوں کے ظلم سے نہیں، بلکہ
خود انسانوں سے نفرت کرتا ہوں۔۔۔ .... ہاں اس نے
کیا کہا تھا کہ "تم خدا کو نہیں جانتے" وہ ضرور خدا کو جانتی تھی۔
رات کے دو بجے دونوں ماں بیٹیاں نماز پڑھ رہی تھیں۔.......

میں بھی آخر خدا سے کیوں ناراض ہو گیا۔ خدا کا اس میں کیا قصور ہے
میں سخت گنہگار ہوں! میں نے اپنی تمام زندگی خراب کرلی۔ اُف! اب
کیا ہوگا! یا اللہ میں اپنے قصوروں پر سچے دل سے ناراض ہوں، یا اللہ
تو میری خطاؤں کو معاف کردے۔ یا اللہ اب کبھی میں ایسا نہ کروں گا۔
لال لال اور خوفناک آنکھوں میں جو برسوں سے کبھی نم آلود نہیں ہوئی
تھیں آنسو بھر آئے۔ اور وہ ایک جگہ بیٹھ کر زار و قطار رونے لگا۔ روتے
روتے اس کی آنکھوں کے سامنے پھر نماز پڑھنے والی ماں اور بیٹی کی
تصویر آئی اور وہ خود بھی بے اختیار سجدے میں گر پڑا۔

ممتاز جب اپنی گریہ وزاری اور سجدہ گذاری سے فارغ ہوا تو رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ وہ اُٹھا اور نہایت تیز چال سے سیدھا اس گاؤں کی طرف کو چل پڑا جہاں جمیلہ اور اس کی ماں رہتی تھیں۔ کوئی دو بجے کے قریب وہ اس گاؤں میں پہنچا اور پھر اسی نیچی دیواروں والے کچے مکان کی دیوار پر چڑھ کر وہ مکان کے اندر گیا اور پھر اس کی نگاہوں نے یہی تماشہ دیکھا کہ صاف ستھرے دالان میں جانماز بچھی ہے اور اس پر ماں اور بیٹی دونوں نماز پڑھ رہی ہیں۔ ممتاز تھوڑی دیر تک کھڑا دیکھتا رہا اور پھر کسی اندرونی خواہش سے مغلوب ہو کر وہ بھی ان ہی عورتوں کے برابر جا کر سجدے میں گر پڑا۔ اور اُس وقت تک سر نہ اُٹھایا جب تک کہ وہ دونوں اپنی نماز ختم نہ کر چکیں۔

نماز ختم ہوئی سجدے سے سر اُٹھایا گیا۔ اور پھر ممتاز نے انتہائی عاجزی کے ساتھ کہا

اماں میں گنہگار ہوں، میں مجرم ہوں، میں قصوروار ہوں۔ میں نے مدت تک انسانوں کے قصوروں کے لئے خدا کی صنعتوں سے نفرت کی ہے انسانوں کے ظلم وستم دیکھ دیکھ کر مجھے انسانوں سے نفرت ہو گئی تھی، مگر تم نے میری آنکھیں کھول دیں۔ میں اب سب کچھ سمجھ گیا ہوں، لیکن خدا کے لئے یہ بتا دو کہ کیا خدا میرے پچھلے گناہ معاف کر سکتا ہے؟"

بوڑھی۔ بیٹا گناہ کرنے کے بعد اگر آدمی سچے دل سے توبہ کرے تو یہ ایسا ہی ہو جاتا ہے کہ جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں تھا۔ دنیا میں ایک تم ہی

اکیلے گناہگار نہیں ہو۔ہم میں سے ہر شخص کچھ نہ کچھ غلطی کرتا رہتا ہے،
اور مبارک ہیں وہ روحیں جو تمہاری طرح سچے دل سے اپنے قصور پر
نادم ہو کر اپنے مالک کے حضور میں حاضر ہو جائیں۔میں تمہیں یقین
دلاتی ہوں کہ اس وقت تم مجھ سے زیادہ معصوم ہو۔اگر تم پسند کرو تو
میں بڑی خوشی سے اس کے لئے تیار ہوں کہ تم یہیں رہا کرو، اور
میری زمین کو جوتا بویا کرو۔ابھی تم بالکل نوجوان ہو اگر محنت سے کام
کرو گے تو خدا اسی میں برکت دیگا۔اور تم امیر کبیر بن جاؤ گے۔
لیکن اس بات کو کبھی نہ بھولنا کہ خدا صرف اپنے انہی بندوں سے
محبت کرتا ہے جو اس کے بندوں سے
محبت کریں

بخار کا تعویذ

برسات کا موسم ختم کے قریب تھا۔اس سال اس قدر کثرت سے بارش ہوئی تھی کہ گاؤں میں اب تک ہر جگہ پانی ہی پانی نظر آتا تھا سارے جوہڑ اور تالاب بھرے پڑے تھے۔دھانوں کے کھیت ہر طرف لہلہارہے تھے۔اور گاؤں والوں کا بیان تھا کہ مدتوں سے اتنی اچھی بارش اور دھانوں کی ایسی اچھی فصل نہیں ہوئی تھی۔ہر ایک گاؤں میں مچھروں کی وہ کثرت تھی کہ الامان والحفیظ!۔ چھوٹے اور بڑے اور زہریلے اور بے زہر کے غرض ہر قسم کے مچھر ہر جگہ ہر وقت اُڑتے رہتے تھے۔اور گاؤں والوں پر راتوں کی نیند حرام کر دی تھی۔بارش کی وجہ سے گرمی کم ضرور ہو گئی تھی۔لیکن ابھی اتنی کم نہ ہوئی تھی کہ کچھ اوڑھ کر سویا جا سکے۔اور بغیر کچھ اوڑھے مچھر چین نہیں لینے دیتے تھے۔

مچھروں کی کثرت کے ساتھ جاڑے بخار کی بھی کثرت اور شدت لازمی تھی۔ستمبر کے مہینے میں لوگوں کو جاڑا بخار آنا شروع ہوا۔ اور یہ حالت کر دی کہ گھر میں دس آدمی تھے تو دسوں چارپائی پر پڑے تھے۔گاؤں کے کڑیل اور محنتی جوان چار چھ دن کے بخار میں ایسے

ہوجاتے تھے کہ گویا چھ مہینے کے بیمار ہیں۔ مردوں کے ہاتھ پاؤں سوکھے ہوے اور لاغر۔ اور عورتوں کے چہرے پیلے اور بے رونق غرضیکہ رام نگر کی ساری کی ساری آبادی جس کا شمار ایک ہزار کے قریب تھا، فصلی بخار کی مصیبتوں میں مبتلا تھی۔ سرکاری اسپتال گاؤں سے چھ میل کے فاصلہ پر فیروز پور میں تھا۔ لیکن بخار کی اس قدر تیزی اور ایسی سخت کمزوری میں اتنی دور کون جاتا۔ اور دوا لاتا۔ بچوں اور بوڑھوں سب کے پیٹ میں تلمیاں بڑھ گئی تھیں۔ خون کی سرخی اور تازگی جاتی رہی تھی۔ اور بہت سے آدمی دو دو تین تین ہفتے تکلیف اُٹھا کر اسی بیماری سے مر بھی چکے تھے۔ گاؤں میں عام طور پر یہ خیال ہوگیا تھا کہ پندرہ دن سے زیادہ جو کوئی بیمار رہا، وہ بس گیا۔ اچھے ہوجانے والے اکثر اس مدت کے اندر اچھے ہوجاتے تھے۔

مولوی کریم اللہ ہی گاؤں بھر میں ایک ایسے شخص تھے، جو کچھ پڑھنا لکھنا جانتے تھے اور جن کے پاس ایسی مصیبت کے وقت میں لوگ آ سکتے تھے۔ بچپن میں مولوی صاحب نے کسی سے سُن رکھا تھا کہ جاڑے بخار میں گلو بہت فائدہ پہنچاتی ہے۔ اس لئے وہ ہر شخص کو جو اُس کے پاس آتا گلو پینے کے لئے بتا دیا کرتے اور ساتھ ہی ایک تعویذ لکھ کر دے دیتے، اور یہ ہدایت کر دیتے کہ اسے لوبان کی دھونی دے کر اور ہرے کپڑے میں لپیٹ کر بازو پر باندھ

لیتا۔ اس تعویذ کی قیمت تو بھلا کون دے سکتا تھا۔ گاؤں کے زمیندار کے پاس بھی اتنا روپیہ نہ تھا۔ لیکن مولوی صاحب نے خدا واسطے کا کام سمجھ کر اس کا ہدیہ پانچ آنہ اور پانچ پیسے کی مٹھائی مقرر کر دیا تھا۔ تاکہ سب لوگ اس سے فائدہ اُٹھا سکیں۔ لوگوں کو اس تعویذ سے کچھ فائدہ پہنچا یا نہ پہنچا، اس کے متعلق روایات مختلف ہیں۔ لیکن اس بات پر سب کا اتفاق تھا کہ خود مولوی صاحب کو اس سے بہت فائدہ پہنچا۔ مولویائن کے لئے نئی چاندی کی پازیب بنی اور لڑکی کے جہیز کی بہت سی چیزیں خرید لی گئیں۔ خود مولوی صاحب کا پُرانا نیلا تہمد بھی اب ایک نئے سفید لٹھے کے تہمد سے بدل گیا۔ اور گاؤں کے قصائی کے حساب کے متعلق بھی سنا گیا کہ ایک عرصہ سے جو کچھ باقی چلا آ رہا تھا وہ سب بیباق کر دیا گیا۔ مولوی صاحب کی بات چیت اور چال ڈھال میں بھی کافی فرق آ گیا تھا۔ اور اب وہ لوگوں کے سلام کے جواب میں "وعلیکم السلام" کے بدلے "میاں" یا بھائی کہنے، یا صرف ذرا سا سر ہلا دینے پر اکتفا کرنے لگے تھے۔

جاڑے بخار کی شدّت کے ساتھ ساتھ تعویذ کی شہرت بھی برابر ترقی کرتی رہی۔ اور اب اکثر آس پاس کے دیہات سے بھی لوگ اس کے لینے کے لئے آنے لگے۔ اور کوئی منحوس ہی دن ایسا ہوتا تھا کہ جب پندرہ بیس تعویذ نہ بک جاتے ہوں۔ مولوی کریم اللہ کے متعلق اتنا تو بالتحقیق معلوم تھا کہ اُنھوں نے کلام مجید کا پہلا پارہ اور راہ نجات

پڑھی تھی - ان کے علاوہ جن کتابوں کے نام وہ لیا کرتے تھے وہ ان کے گھر میں رکھی ضرور تھیں - لیکن ان کے مطالعہ میں نہیں آئی تھیں - ان کی بیوی اسی گاؤں کی ایک شریف زادی تھیں، اور مولوی صاحب کے ہر قسم کے ناگفتہ بہ مظالم پر صبر کرکے اپنی شرافت کا بہت کافی ثبوت دے چکی تھیں - مولوی صاحب کی ایک لڑکی تھی جس کا نام محمدی بیگم تھا، اس کی عمر اب چودہ سال کے قریب تھی، لیکن گاہے ماہے ایسا ہوتا رہتا تھا کہ سالن میں ذرا سا نمک تیز ہو جانے پر، یا کوئی مٹی کا پیالہ اس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ جانے پر مولوی صاحب انتہائی بے دردی کے ساتھ اس کے دو چار طمانچے رسید کر دیا کرتے تھے -

---
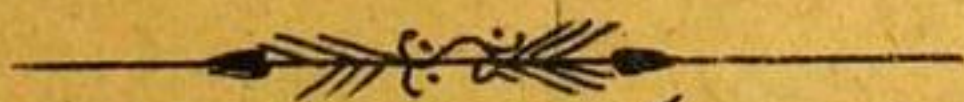
ہجور (حضور) ہمر وا ایکئی (ایک ہی) لڑکوا (لڑکا) ہے - واکو (اسے) ایسو بکھار چڑھو ہے کہ ہوس نا ئے رہے - ہم سے ہنگلوا نے کہی تھی تو ہم ہجور کے پاس آئے ہیں - ہجور کی بڑی پروستی (پرورش) ہوگی ایک تا ئیج (تعویذ) ہموؤں کو (ہم کو بھی) مل جائے - یہ الفاظ بڑی لجاجت کے ساتھ جمن نے مولوی کریم اللہ سے کہے - جمن کی عمر کوئی پچپن برس کی تھی - وہ جلاہا تھا اور اپنی جوانی کے زمانہ میں اپنے اسی پیشہ کے ذریعہ سے کافی پیدا کر لیا کرتا تھا - آہستہ آہستہ رنگین اور نرم جھمکدار اور ولائتی کپڑے رام نگر میں بھی عام ہوتے چلے گئے - اور انہی کے ساتھ

ساتھ جمن کے بنے ہوئے کپڑے کی قدر و قیمت گھٹتی چلی گئی۔ اب بھی وہ اور اس کا بیٹا اگرچہ گاڑھے کے تھان بنا کرتے تھے۔ لیکن ان کا خریدنے والا کوئی نہ ہوتا تھا۔ اور بڑی مشکل سے سارے گاؤں میں پھر کر وہ اسے اونے پونے بیچ کر اپنی روزی کمایا کرتے تھے جمن تو بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس لئے اس کے لئے اب کوئی اور کام سیکھنا محال تھا۔ لیکن اس کے لڑکے نے مجبور ہو کر کاشتکاری شروع کر دی تھی اور کسی نہ کسی کی زمین لے کر اُسے جوتا بویا کرتا تھا۔ فصلی بخار نے پہلے جمن کو اچھی طرح دبایا اور اب اس کے اچھا ہو جانے پر اس کے لڑکے شبراتی کو چارپائی پر ڈال دیا۔ جو دو چار پیسے گھر میں تھے، وہ جمن ہی کی بیماری میں خرچ ہو چکے تھے اس لئے ان غریبوں کے پاس اتنا بھی نہ تھا کہ روکھی سوکھی روٹی ہی پیٹ میں ڈال لیں۔ منگلو گاؤں کا چمار تھا اور اسی نے ایک دن جمن کو بتایا تھا کہ مولوی صاحب کا تعویذ لاکر شبراتی کے بازو پر باندھ دے۔

مولوی صاحب نے جمن کو سر سے پاؤں تک دیکھا، اور پھر کہا

"سوا چھ آنہ پیسے دینے پڑیں گے لایا ہے؟"

جمن "حضور! ہم بہت گریب ہیں۔ ہمارے پاس کھان دکھلنے تک کو نا نے ہے"

مولوی صاحب۔ "تعویذ مفت نہیں مِلا کرتا۔ جا کے کہیں سے پیسے لاؤ"

جمن۔ "حضور، ہمیں اللہ نام پہ دیدیں۔ پیسہ ہمارے پاس ایک بھی نہیں ہے"

مولوی صاحب۔ (جھڑک کر) "ارے کیسا پاگل آدمی ہے۔ تجھ سے کہہ دیا کہ تعویذ مفت میں نہیں ملتا ہے۔ ہم کوئی تعویذ کی قیمت تھوڑی ہی لیتے ہیں۔ یہ تو تعویذ کی نذر ہے۔ کہیں سے قرض اُدھار کر کے سوا چھ آنے پیسے لے آؤ۔ یوں تعویذ نہیں ملے گا۔"

جمن۔ "تو مولوی صاحب آپ ہی اُدھار کر لیں۔ شبراتی اچھا ہو جائیگا تو ہم آپ کا ایک ایک پیسہ دیدیں گے۔"

مولوی صاحب۔ "بے وقوف کہیں کا، ان چیزوں میں کہیں اُدھار ہوتا ہے۔ یہ تو اللہ کے نام کی نیاز ہے۔ جاؤ بس ہم نے کہہ دیا کہ پیسے لے آؤ نہیں تو تعویذ نہیں ملے گا۔"

جمن نے دوڑ کر مولوی صاحب کے پاؤں پکڑ لئے۔ اور ان کے قدموں پر اپنا سر رکھ کر رونے لگا۔ اس کے پاس ایک پیسہ بھی نہ تھا۔ اور اسے معلوم تھا کہ اسے اتنے پیسے کہیں سے اُدھار بھی نہیں مل سکتے اس سے پہلے اس نے کبھی کسی شخص کی اس طرح خوشامد نہ کی تھی۔ اور ایک غریب جلاہا ہونے کے باوجود اس میں کسی نہ کسی حد تک خودداری موجود تھی۔ بیٹے کی محبت اور افلاس کی مجبوریوں نے اسے مجبور تو کر دیا اور وہ مولوی صاحب کے قدموں پر گر بھی پڑا۔ لیکن اس خودداری کی شکست پر اس کا دل کچھ ایسا دُکھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

مولوی صاحب نے ایک بے پروائی کی ادا سے اپنا پاؤں سمیٹ

لیا اور اپنا آخری اور قطعی فیصلہ سنا دیا کہ "تعویذ نہ مفت مل سکتا ہے اور نہ اُدھار اور اگر تعویذ لینا ہے، تو چوری کرو یا بھیک مانگو لیکن سوا چھ آنے پیسے لے کر آؤ"

مایوس اور غم نصیب جمن اُٹھا اور اُٹھتے ہی جب اس کی نگاہ مولوی صاحب کے چہرے پر پڑی تو اسے چکّر سا آگیا۔ اور وہ پھر گر گیا۔ اس کا دل کچھ تو اتنے دنوں کی بیماری کی وجہ سے کمزور ہو چکا تھا اور کچھ اس وقت کے صدمہ نے اس پر اثر کیا۔ قلب کی حرکت بہت ہی کمزور ہو گئی اور دیر تک وہ اس قابل نہ ہو سکا کہ اُٹھے اور گھر کو چلا جائے۔

مولوی صاحب اسے آخری جواب دے کر گھر میں جا چکے تھے، اور جب ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکوں نے اسے پھر ہوشیار کیا تو اس نے دیکھا کہ وہ تنہا مولوی صاحب کے گھر کے سامنے پڑا ہے بوڑھا اور ناتوان جمن بہ قت تمام اُٹھا اور آہستہ آہستہ اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ بار بار اس نے مُڑ مُڑ کر مولوی صاحب کے گھر کی طرف دیکھا، اور ہر مرتبہ ایک بہت ہی ٹھنڈا سانس بھرا۔ اُسے رہ رہ کر افسوس ہو رہا تھا کہ کیوں اس نے ایسی ذلّت برداشت کی کہ مولوی صاحب کے قدموں پر سر رکھ دیا۔

مولوی صاحب جب جمن کو جواب دے کر گھر میں گئے، تو ان کی بیوی نے پوچھا۔

بیوی۔ "اے ہے یہ کون بڈھا تھا، جو ایسی خوشامدیں کر رہا تھا"۔
مولوی صاحب۔ "وہ تھا وہی بیوقوف جمن۔ پیسے تو لایا نہیں اور تعویذ لینے آ کھڑا ہوا"۔

بیوی۔ "وہ بیچارہ بڑا غریب ہے۔ اس کے پاس پیسے کہاں رکھے تھے۔ ایک تعویذ پیسوں کے بغیر ہی دیدیتے۔ تو کیا حرج تھا"۔
مولوی صاحب۔ "ہاں ہاں دے کیوں نہیں دیتے، ایسے مفت لٹانے لگوں تو پھر پیسے کون دے؟"
بیوی۔ "ایک غریب آدمی کو دینے سے تمہارے تعویذ لٹے جاتے تھے"
مولوی صاحب۔ ایک آدمی کو مفت دے کر پھر عادت بگڑ جاتی ہے اس کے علاوہ وہ پاگل سارے گاؤں میں کہتا پھرتا کہ مولوی صاحب نے بڑا احسان کیا۔ مفت میں تعویذ دے دیا۔ پھر سب لوگ مفت ہی مانگتے ہوئے آتے"۔
بیوی۔ "تمہارا دل بڑا سخت ہے"۔
مولوی صاحب۔ "اس میں سختی کی کونسی بات ہے۔ یہ اللہ کے نام کی نیاز ہے"۔
بیوی۔ "اللہ کے نام کی نیاز ہے، تو پھر گھر میں کیوں رکھ لیتے ہو"۔
مولوی صاحب (بگڑ کر) "تجھے ان باتوں سے کیا مطلب ہے۔ اپنا کام کیوں نہیں کرتی"۔
بیوی۔ "میں نے کیا بُرا کیا تھا۔ یہی تو کہا تھا کہ جہاں اتنے تعویذ پیسے لیکر

دیتے ہو، وہاں ایک بیچارے بڈھے کو ایک تعویذ مفت دیدیے
مولوی صاحب۔ بس بس چپکی بیٹھی رہ، بڑی رحمدل بن کر چلی۔
وہاں سے آ۔ پازیبیں پہنتے وقت یہ نہیں کہا کہ ان میں سے ایک
اللہ کے نام پہ دیدو۔"

مولوی صاحب کے تیور بہت بگڑ گئے تھے۔ اور بیوی کو بہت سے پچھلے موقعوں کے تجربے یاد تھے۔ کہ اس درجہ تک پہنچنے کے بعد مولوی صاحب کی زبان تو رک جاتی تھی۔ مگر ہاتھ چلنے لگتے تھے۔ اس لیے اس نے خاموشی ہی میں اپنی خیریت دیکھی۔ اور پھر کچھ نہ کہا۔
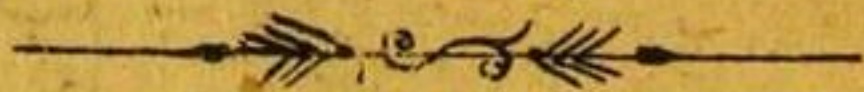
خدا خدا کر کے رام نگر سے بخار کی وبا دور ہوئی۔ سردی کا موسم آگیا۔ مچھر کم ہو گئے۔ اور جو لوگ مرنے سے بچ گئے تھے۔ ان کی صحت آہستہ آہستہ پھر کسی قدر درست ہونے لگی۔ بڈھے جمن کا لڑکا کسی طرح جانبر نہ ہو سکا اور بوڑھے باپ کو اس کی ذات سے جو آرام میسر تھا وہ جاتا رہا۔ جوان بیٹے کی موت یونہی ماں باپ کے لیے ایک ایسا صدمہ ہوتی ہے۔ جسے برداشت کرنا آسان نہیں ہوتا۔ نہ کہ جمن کا لڑکا جو صرف بیٹا ہی نہیں، بلکہ ضعیفی کا سہارا بھی تھا۔ بڑھیا اور بڈھے کی حالت اس کے غم میں بہت ہی خراب ہو گئی۔ اور اگرچہ اب دو مہینے کے قریب گذر چکے تھے۔ لیکن کوئی دن ایسا نہ ہوتا تھا کہ دونوں شبراتی کو یاد کر کے آنسو نہ بہا لیتے ہوں۔ جمن کو زندگی سے اب کوئی دلچسپی نہ

رہی تھی۔ اور اب وہ صرف اس لئے کہ اپنا اور بیوی کا پیٹ بھرنا ضروری تھا مجبوراً تھوڑا بہت کام کر لیا کرتا تھا۔ بڑھیا کی حالت اس بھی زیادہ تباہ تھی۔ اس کی آنکھ کے آنسو کسی وقت نہ تھمتے تھے۔ اور اس کے خیال میں یہ بات جم گئی تھی کہ شبراتی کو مولوی صاحب نے مارا۔ اگر وہ تعویذ دے دیتے تو وہ ضرور بچ جاتا۔

ایک دن دوپہر کو جمن نے آکر کہا۔

"مولوی صاحب کی لڑکی کا کل بیاہ ہے۔ بڑی دھوم سے تیاریاں ہو رہی ہو رہی ہیں

بڑھیا۔ ٹھنڈا سانس بھر کر "ہوگا، پھر ہمیں کیا"؛

جمن "شبراتی زندہ ہوتا تو ہم اب کی فصل پر اس کا بیاہ کر دیتے"۔

دونوں میاں بیوی رونے لگے۔ تھوڑی دیر بعد بڑھیا نے آنسو پونچھے اور پوچھا۔

بڑھیا۔ "بیاہ کہاں ٹھیرا ہے؟"

جمن۔ "سُنا ہے دیورنیا سے برات آئیگی"۔

بڑھیا۔ "کسی مولوی کے لڑکے سے بیاہ ہوگا؟"

جمن "نہیں تو! دیورنیا میں شیخ عبداللہ ہیں نا۔ جن کے کئی بسوے ہیں۔ ان کے لڑکے سے ٹھیری ہے"۔

بڑھیا "تو وہ شیخ جی تو بڑے امیر آدمی ہوں گے؟"

جمن۔ "ہاں اپنے دال روٹی سے خوش ہیں"۔

بڑھیا۔ "پھر انہوں نے بیٹے کا بیاہ کسی اور جگہ کیوں نہیں کیا؟ مولوی صاحب کے پاس دینے کو کیا رکھا ہے؟"

جمن۔ "اب تو اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ اس دفعہ بخار میں مولوی صاحب نے خوب اپنا گھر بھر لیا تھا۔"

بڑھیا۔ "پھر تو لیا ہی ہوگا۔ گاؤں کا سارا پیسہ کھینچ کھینچ کے، اسی کے گھر میں تو گیا ہے۔ اللہ اس کا ناس کرے۔"

جمن۔ "تم بڑی ہی بیوقوف ہو۔ میں کئی دفعہ تم سے کہہ چکا ہوں کہ تم کسی کو کوسا نہ کرو۔ مگر تم باز نہیں آتیں۔"

بڑھیا۔ (آبدیدہ ہو کر) "جس نے ہمارا دل دُکھایا ہے۔ اُسے کوسیں نہیں تو اور کیا کریں۔؟"

جمن۔ "کوسنے سے تمہیں کیا مل جائے گا؟ شبراتی تو زندہ ہونے سے رہا۔"

بڑھیا۔ (رو کر) "جیسا مجھ غریب کے جوان بچے کو اس نے مارا ہے بس میں اور کچھ نہیں کہتی اس کے آگے آئے۔"

جمن۔ "توبہ کرو۔ توبہ کرو۔ کسی کو کوسنا اچھا نہیں ہوتا۔ ہمارے بچہ کی موت اسی بہانہ لکھی تھی۔ وہ تعویذ دے بھی دیتے تو کیا وہ بچ جاتا گردھاری کا بیٹا کیوں نہ بچ گیا؟ اللہ دیا کی بہن کیوں مرگئی؟ ان سب نے تو کئی کئی دن تک روز نیا تعویذ لا لا کر باندھا تھا۔"

بڑھیا۔ "ایسے اگر شبراتی بھی مرتا تو ہمیں بھی صبر آجاتا۔ کہ ہم نے اس کی

دوا دارو تو کرلی۔

جمن - "قضا کے سامنے دوا دارو اور گنڈا تعویذ کچھ نہیں چلتا۔ شبراتی تو اللہ کو پیارا ہو چکا تھا۔ بیچارے مولوی صاحب اسے کیا بچا سکتے تھے۔ ہاں میرے دل کو یہ رنج ضرور ہے کہ مینے بے ناحق کو (ناحق) مولوی صاحب کی اتنی خوشامد کی۔ ہمارے گاؤں میں ایک آدمی بھی ایسا نہیں ہے، جس کی میں نے ایسی خوشامد کی ہو۔ اور اتنی خوشامد میں کسی اور آدمی کی کرتا، تو وہ ضرور میرا کہنا مان لیتا"

جمن کو اپنی ذلت کا احساس یوں تو ہر وقت ہی ہوتا رہتا تھا۔ مگر اس وقت کی گفتگو نے اُسے اور بھی تازہ کر دیا۔ اور وہ سر جھکا کر خاموش بیٹھ گیا۔ بڑھیا دل ہی دل میں، مولوی صاحب کو کوستی رہی۔
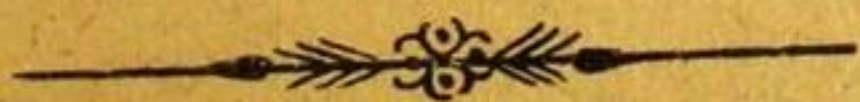
مولوی کریم اللہ آج بہت ہی خوش ہر قسم کے انتظام کرتے پھر رہے تھے۔ مٹی کی رکابیاں اور پیالے۔ بیلوں کے لئے بھُس۔ گھوڑوں کے لئے گھاس اور فرش کے لئے چٹائیاں، سارے گاؤں سے اکٹھی کر کے چوپال میں رکھواتے۔ حقے اور پینے کا تمباکو اِدھر اُدھر سے جمع کر کے نائی کی سپردگی میں دیتے۔ اور براتیوں کے سونے کے لئے جو مکانات خالی کرائے گئے تھے ان میں پیال بچھواتے انہیں صبح سے دوپہر ہو چکی تھی گذشتہ تین چار مہینے کے عرصہ میں ان کا پیٹ بہت بڑھ گیا تھا اور اب بہت سا چلنا پھرنا، یا زیادہ کام کاج

کرنا ان کے لیئے دشوار تھا۔ موقعہ کی اہمیت اور وقت کی ضرورت سے مجبور ہو کر بیچارے ہانپتے ہوئے ادھر سے اُدھر جاتے تھے۔ اور بار بار تھک کر دم لینے کے لیئے بیٹھ جاتے تھے ہر دس پندرہ منٹ کے بعد گھر آتے اور کوئی نہ کوئی "تازہ حکم بیوی کے نام جاری کر جاتے۔ حجام کا لڑکا صبح سے اس وقت تک کئی مرتبہ پٹ چکا تھا۔ اور بنیئے اور قصائی کی ٹانگیں، مولوی صاحب کے گھر کے پھیرے کرتے کرتے دکھ گئی تھیں

شام کے قریب اپنے خیال میں سب کاموں سے فارغ ہو کر اور فی الحقیقت تکان سے بالکل چور ہو کر وہ گھر میں آئے کہ اطمینان سے لیٹ کر حقہ پئیں۔ دروازہ ہی سے بیوی کو حکم دیدیا گیا کہ تازہ کر کے توے کا حقہ بھر دے۔ اور خود صحن میں چارپائی پر لیٹ کر زور زور سے ہانپنے میں مصروف ہو گئے۔ بیوی غریب صبح سے کام کرتے کرتے بالکل تھک چکی تھی۔ اور ہاتھ بالکل شل ہو گئے تھے۔ بے دلی سے اس نے حقہ اُٹھایا اور تازہ کر کے مولوی صاحب کی چارپائی کے پاس رکھدیا۔

توے کی چلم بھر کر اور خوب بہت سی آگ رکھ کر لیئے آرہی تھی کہ اتفاق سے چلم سے ایک چنگاری اُڑ کر اس کے ہاتھ پر گری۔ اور جب ہاتھ جلا تو بے اختیار چلم چھوٹ پڑی۔ اور ٹوٹ گئی۔ مولوی صاحب انتہائے شوق کے ساتھ چلم کو دیکھ رہے تھے اور حقہ پینے کے لیئے اس قدر بیتاب تھے کہ بار بار ان کا جی چاہتا تھا کہ دوڑ کر بیوی کے ہاتھ سے چلم لیں، اور ممکن ہو تو پیٹ میں رکھ لیں۔ چلم کو گر کر ٹوٹتے دیکھ کر ان کے غصہ کی کوئی انتہا نہ

نہ رہی بے اختیار چارپائی سے اُٹھے۔ اور عالم غیظ میں حقہ کی نے لے کے دوڑے۔ غصّے سے اندھے تو ہو ہی رہے تھے، راستہ میں مصالحہ پیسنے کی سِل پڑی تھی۔ اس سے کچھ اس بُری طرح ٹھوکر کھائی کہ سنبھل ہی نہ سکے۔ اور بہت ہی بُری طرح گر پڑے۔ تین ساڑھے تین من کی لاش کا سارا بوجھ صرف ایک پاؤں پر پڑا تو گھٹنا اتر گیا۔ اور شدید ترین تکلیف کے عالم میں وہ بالکل بچوں کی طرح چیخ چیخ کر رونے لگے۔ بیوی نے بہتیرا چاہا کہ انہیں اُٹھائے۔ مگر وہ نہ اُٹھ سکے مجبوراً محلہ والوں کو خبر کی گئی۔ پانچ چھ مضبوط جوانوں نے مِل کر انہیں اُٹھایا اور چارپائی پر ڈالا۔ مگر ان کا یہ عالم تھا کہ ایک چیخ زمین تھی اور ایک آسمان۔ اول تو مولوی صاحب یونہی ذرا کمزور طبیعت کے آدمی واقع ہوئے تھے، اس پر گھٹنا اُتر جانے کی تکلیف، اُنہوں نے بے اختیار چیخنا اور رونا شروع کر دیا۔ لوگ بھی سب پریشان تھے کہ ایسی حالت میں کیا کیا جائے۔ قریب سے قریب شفاخانہ بھی چھ میل کے فاصلہ پر تھا۔ وہاں تک اگر انہیں لے جایا جائے، تو کس طرح لے جایا جائے۔ اس کے علاوہ صبح کو برات آنے والی تھی۔ اور اس کے لئے ان کی موجودگی لازمی۔ پریشانی اور بدحواسی کے عالم میں لوگ ایک دوسرے سے مشورہ کر رہے تھے۔ اور ہر شخص اپنی اپنی سمجھ کے موافق تدبیریں بتا رہا تھا کہ اسی اثناء میں گھسیٹا حجام آ گیا اور جب اسے سب حال معلوم ہوا تو اس نے کہا:-

" اجی صاحب یہ تو ابھی ابھی بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ وہ ہے ناجمن جلاہا، وہ اس کام میں بڑا ہشیار ہے۔ حسین خاں کا ہاتھ کہنی پر سے اُتر گیا تھا تو اس نے ذرا سی دیر میں چڑھا دیا تھا۔ میں اسے بلا کے لاتا ہوں۔"

بہت سی آوازیں اُٹھیں "ٹھیک ہے۔ ہمیں جمن کا خیال ہی نہ آیا۔ جلدی لا بھئی گھسیٹا۔ کہہ دیجیو کہ مولوی صاحب کو بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔"

مولوی صاحب۔ "بھئی مدار بخش تم چلے جاؤ آہ! ارے میرا دم نکلا! کہیں ایسا نہ ہو کہ گھسیٹا کے بُلانے سے وہ نہ آئے۔ آہ!"

مدار بخش۔ "آئیگا تو کیوں نہیں۔ مدا دمگر، تم کہہ رہے ہو تو میں ہی چلا جاؤنگا"

مدار بخش جب جمن کے گھر پہنچا تو وہ موجود نہ تھا۔

"شبراتی کی ماں! جمن کہاں گئے ہیں؟"

شبراتی کی ماں "کھیت پر گئے ہوئے ہیں۔ اب آتے ہی ہوں گے۔ کیا کام ہے؟"

مدار بخش۔ "ارے مولوی صاحب بیچارے ابھی گر پڑے، اور ان کا گھٹنا اُتر گیا۔ درد کے مارے تڑپ رہے ہیں۔ سب نے یہی کہا کہ جمن چڑھانا جانتے ہیں تو میں بھاگ کے آیا کہ انہیں بُلا لے جاؤں۔"

شبراتی کی ماں (غصّہ کا منہ بنا کر) "وہ نہیں جائیں گے۔"

مدار بخش۔ (حیرت سے) "کیوں؟"

شبراتی کی ماں (آنکھوں میں آنسو بھر کر) "اس نے ہمارے شبراتی کو مار دیا اب وہ اس کا گھٹنا چڑھانے جائیں؟ میں تو کبھی نہیں جانے دوں گی۔"

مدار بخش - نہیں - شبراتی کی ماں یہ وقت بدلہ لینے کا نہیں ہے - کل مولوی صاحب کی بٹیا کا بیاہ ہے برات میں کچھ گڑبڑ ہو گئی تو سارے گاؤں کی ناک کٹ جائیگی - بیٹی کا معاملہ ہے - ہم سب کو مدد کرنی چاہیئے۔"

شبراتی کی ماں :- "بھیا ہم بھنگی چمار سب کی خدمت کرنے کو موجود ہیں۔

مدار (مگر) یہ بات ہمارے دل سے نہیں نکل سکتی - مولوی صاحب تو اگر سو روپے بھی دیں، جب بھی میں انہیں نہیں جانے دونگی۔"

مدار بخش :- سو روپے تو غریب کے پاس کہاں رکھے ہیں - ہاں تم کہو تو دس پانچ روپے اُن سے ہم جمن کو دلوا دیں گے۔"

شبراتی کی ماں :- "اس کے روپیوں کو لے کے کیا میں آگ لگاؤں گی؟ بس تم یہی کہہ دینا کہ وہ نہیں آئیں گے۔"

مجبور ہو کر مدار بخش چلا گیا - اور جا کر مولوی صاحب سے کہدیا کہ جمن کسی صورت سے نہیں آسکتا۔

شام کو جب جمن کھیت سے واپس آیا تو شبراتی کی ماں نے کہا " اللہ میاں نے آج میری دعا قبول کر لی۔"

جمن :- "کیا ہوا؟"

بیوی :- اس مولوی صاحب کی ٹانگ ٹوٹ گئی - کھا کھا کے اتنا موٹا ہو گیا

تھا کہ چلنا پھرنا مشکل تھا۔ غرور کے مارے آسمان کی طرف سر اٹھا کے چلا کرتا۔ آج ٹھوکر کھا کے ایسا گرا کہ گھٹنا اتر گیا۔ اب پڑا ہوا چیخ رہا ہے

جمن "برا ہوا۔ اور ہاں کل تو ان کی لڑکی کا بیاہ ہے۔"

بیوی "برا کیوں ہوا۔ بہت اچھا ہوا۔ ہمارے شبراتی کا بیاہ بھی تو ہونے کو تھا۔" (رونے لگی)

جمن:۔ "میں نے تمہیں کتنا سمجھایا۔ مگر تمہاری سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ اللہ کی امانت تھی۔ اس نے لے لی۔"

بیوی ۔(آنسو پونچھ کر)۔ "وہ مدار بخش تمہیں بلانے کو آئے تھے کہ چل کے مولوی صاحب کا گھٹنا ٹھیک کر دیں۔ میں نے تو صاف کہدیا کہ بھنگی اور چمار کے گھر جا کے ہم ان کی خدمت کر آئیں گے۔ مولوی صاحب کے گھر نہیں جائیں گے۔"

جمن (کچھ سوچ کر) "مدار بخش آئے تھے؟ .... تم نے برا کیا...
میں ہوتا تو ضرور ان کے ساتھ چلا جاتا۔"

بیوی ۔ "چلے کیوں نہیں جاتے؟ میں تو ہرگز بھی تمہیں نہیں جانے دیتی اور نہ اب جانے دوں گی۔"

جمن "ان کی کرنی ان کے ساتھ ہے۔ ہماری کرنی ہمارے ساتھ۔
انہوں نے برا کیا تو ہم کیوں برا کریں۔"

بیوی ۔ "میں برا بھلا کچھ نہیں جانتی۔ تم بیٹھ کے حقہ پیو چلم جلی جا رہی ہے۔ میں روٹی نکال کے لاتی ہوں۔"

جمن بیوی کے کہنے سے بیٹھ گیا۔ مگر کچھ کھویا ہوا سا تھا۔ بار بار اس کے دل میں خیال آ رہا تھا کہ مولوی صاحب سخت تکلیف میں پڑے ہوں گے۔ گاؤں میں کوئی آدمی ملنا دلنا جانتا نہیں ہے۔ اور صبح کو برات آنے والی ہے۔ حقہ چھوڑ کر جمن جانا ہی چاہتا تھا کہ بیوی نے روٹی لاکر سامنے رکھ دی۔

دن بھر کی سخت محنت کے بعد جمن کو اگرچہ بڑے زور کی بھوک لگی ہوئی تھی، لیکن نوالے اس کے حلق میں اٹکنے لگے اور بمشکل کوئی آدھی روٹی کھا کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

بیوی۔ "دیکھو میں کہے دیتی ہوں، جو تم مولوی صاحب کے گھر گئے تو اچھا نہیں ہوگا"

جمن۔ "نہیں۔ اب تو تم نے انکار کر ہی دیا۔ اب میں کیسے جاؤنگا مگر ہاں مجھے خیال ہوتا ہے کہ تم نے اچھا نہیں کیا"

بیوی۔ "ایسوں کے ساتھ ایسا ہی کرنا چاہیئے"

جمن۔ "نہیں بُروں کے ساتھ ہم کیوں بُرے بن جائیں"

اب اچھی طرح اندھیرا ہو چکا تھا۔ جمن کی بیوی نے چراغ جلایا اور حقہ بھر کر جمن کے پاس لاکر رکھ دیا اور مطمئن ہو کر گھر کے کام کاج میں مصروف ہو گئی۔

جمن کا دماغ برابر اسی ادھیڑ بن میں مبتلا تھا کہ مولوی صاحب کے گھر جائے یا نجائے۔ اور اسی فکر میں پڑے پڑے اسے رات کے بارہ

بج گئے اور کسی طرح نیند نہ آئی - آدھی رات کو اٹھ کر اس نے پھر حقہ بھرا اور بیٹھ کر پینے لگا۔ حقہ جب جل گیا تو وہ اٹھا اور اپنی لاٹھی اٹھائی " ذرا دیکھیں تو مولوی صاحب کا کیا حال ہے "

کہتا ہوا گھر سے نکلا اور سیدھا مولوی صاحب کے گھر پہنچا۔ وہاں سب جگہ سناٹا پڑا ہوا تھا۔ اسے خیال آیا کہ شاید مولوی صاحب چوپال میں ہوں گے۔ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ اور سب لوگ تو سو رہے ہیں۔ مگر مولوی صاحب درد کی وجہ سے کراہ رہے ہیں۔ کئی مرتبہ آگے بڑھا۔ اور پھر جھجکا۔ پھر بڑھا اور پھر رکا۔ اور آخر ایک دفعہ ہمت کر کے مولوی صاحب کے قریب پہنچ ہی گیا۔ آہستہ سے ان کی ٹانگ پکڑ کر اپنے مخصوص طریقہ پر کھینچی۔ انتہائے تکلیف کی وجہ سے مولوی صاحب غنودگی سے چونک کر بڑے زور سے چیخ پڑے۔ اور جمن کو دیکھا۔ جمن نے نہایت اطمینان کے ساتھ ٹانگ کو ذرا گھما کر آہستہ سے چھوڑ دیا۔ ایک آواز ہوئی ہڈی اپنی جگہ پر جا بیٹھی۔ اور جمن اپنی لاٹھی اٹھا کر چلتا بنا۔ مولوی صاحب نے ہر چند پکارا اور قسمیں دیں، مگر اس نے لوٹ کر نہ دیکھا۔

بڑا آدمی

"اے نورا جا تو سہی تھوڑی لکڑیاں تو بین لا گھر میں ایک بھی لکڑی نہیں ہے۔ میں روٹی کاہے سے پکاؤں" یہ آواز ایک بوڑھی عورت کے منہ سے نکلی، جو کلکتہ کے سب سے غریب اور سب سے غلیظ محلہ میں ایک نہایت ہی تنگ و تاریک کوٹھری کے اندر رہتی تھی۔ اس کوٹھری کو صرف اس لئے کوٹھری کہا جاسکتا تھا کہ اس کے سوا کوئی اور نام اس کے لئے اور بھی زیادہ ناموزوں ہوتا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مُرغیوں اور کتّوں کے رہنے کی کوٹھڑیاں بھی بالعموم اس سے زیادہ وسیع اس سے زیادہ آرام دہ اور اس سے زیادہ صاف ہوتی ہیں۔ چھت کے نام سے اس پر ٹین کے چند ٹکڑے پڑے ضرور تھے۔ لیکن کچھ اس طرح کہ جابجا جگہ چھوٹی ہوئی تھی۔ اور بارش کے وقت مینھ اگر سارا نہیں تو کم سے کم نصف پانی ضرور اس کے اندر آجاتا تھا۔ دیواریں کچھ کچّی اور کچھ پکّی اور وہ بھی جابجا سے ریختہ اور شکستہ، کوٹھری میں رہنے والوں کے لئے ایک مستقل خطرہ تھیں۔ اور آندھی اور مینھ میں ہر وقت ان کے گر پڑنے کا کھٹکا لگا رہتا تھا۔

بڑھیا اور بڑھیا کی ضعیف آنکھوں کا نور، نورا دو آدمی اس کوٹھری میں رہا کرتے تھے۔ اور کسی اور کرایہ دار کو شریک کرنے کی انہیں صرف اس

لیے ہمت نہ ہوئی کہ اس میں دو سے زیادہ آدمی کسی طرح سما ہی نہ سکتے تھے، ورنہ ان کی غربت اور ان کا افلاس اسی کا متقاضی تھا کہ چھ روپیہ ماہانہ کی گرانقدر رقم میں سے کم از کم دو روپے اس طرح بچالیں کہ ایک اور کسی غریب و نادار شخص کو اس میں اپنے ساتھ ٹھیرالیں۔ بڑھیا اور اس کے نورِ نظر کے بدن پر کوئی چیز ایسی تھی ضرور جسے محض اس لیے کہ اس سے جسم کا کوئی حصہ پوشیدہ تھا، مجبوراً پوشاک ہی کہنا پڑیگا۔ ورنہ فی الحقیقت وہ دو ایک پھٹے پرانے، غلیظ اور کثیف چیتھڑے تھے، جنہیں کسی نہ کسی طرح جسم پر لپیٹ لیا گیا تھا، اور جن کا بیشتر حصہ آستین و دامن ہونے کی بجائے جیب اور گریبان تھا۔ بڑھیا کی آمدنی کا صرف ایک ذریعہ تھا اور وہ یہ کہ وہ روزانہ صبح سے شام تک دو ایک گھروں میں جاکر کام کیا کرتی تھی۔ اس طرح مستقلاً ہر مہینے پندرہ یا سولہ روپے کمالیتی تھی۔ عزیزی نورالدین عرف نورا کی عمر بمشکل کوئی بارہ سال کی تھی۔ اور ماں کی محبت نے ابھی تک یہ گوارا نہ کیا تھا کہ اس کے نازک جسم کو بارکشی یا خدمت گذاری کی مصیبتوں میں مبتلا کیا جائے۔ اس سے وہ تمام دن فطرت کی گوناگوں دلچسپیوں کے مطالعہ میں بسر کیا کرتے تھے۔ اور سامنے کی بڑی سڑک سے گزرنے والی ہر موٹر کو دیکھ کر اپنے ہم عمر ساتھیوں سے کہا کرتے تھے کہ "ہم اس سے بھی اچھی خریدیں گے"! نورالدین کی شکل و صورت بھی خاصی اچھی تھی، اور ہاتھ پاؤں بھی خوب مضبوط اور طاقت ور تھے۔ اور انہی کے بل بوتے پر انہوں نے اس محلہ کے تقریباً تمام لڑکوں کی سرداری حاصل کی تھی طبیعت میں

سختی اور ظلم ایک بڑی کافی حد تک موجود تھا۔ اور مقابلہ میں آنیوالے ہر لڑکے کو اس حد تک مارنا کہ آیندہ کبھی ایسی گستاخی کی جرأت نہ کرسکے ان کا معمولی شعار تھا۔ ماں اور بیٹے میں جب کبھی محبت اور پیار کی باتیں ہوا کرتی تھیں، تو بالعموم یہی ہوتی تھیں کہ بیٹا دولتمند اور امیر کبیر بننے کی اپنی آرزوئیں پیش کیا کرتا۔ اور بوڑھی ماں نہایت ہمت افزا طریقہ پر یہ کہدیتی کہ بیٹا ہمیشہ چھوٹی ہی چیز بڑھ کر بڑی ہوتی ہے۔ اگر تمہارے دل میں تمنا ہے تو ضرور تم بڑے آدمی بن جاؤگے۔ کئی مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ ماں اور بیٹا ساتھ جارہے ہیں اور سڑک پر کوئی بہت ہی امیر آدمی موٹر پر گذرا تو نورالدین نے فوراً ماں سے کہا کہ اماں میں تو ایسا امیر آدمی بنوں گا۔ اور ماں نے یہ جواب دیکر اس کی ہمت بڑھادی کہ ہمت اور محنت کے نزدیک کچھ مشکل نہیں ہے۔

بدقسمتی سے نورالدین کو تعلیم نہ مِل سکی اور اس کی ریاضی کی معلومات بس یک گنتی سے اور جغرافیہ کا علم کلکتہ اور اس کے مضافات سے آگے نہیں بڑھا۔ ان حالات میں نورالدین نے تھوڑے سے چاول اور ذرا سی کسی ترکاری کی بھجیا کھا کھاکر اپنی عمر کے تیرہ سال پورے کئے تھے کہ یکایک ایک دن محمد عمر اس کے مکان پر آئے اور اسے بُلایا۔ وہ محمد عمر کو پہچانتا تھا اور اسے معلوم تھا کہ اس کی ماں ان کے گھر کام کیا کرتی ہے، اس لئے وہ ان کے پاس گیا۔ اُنہوں نے اس سے کہا

محمد عمر "تمہاری ماں بہت سخت بیمار ہوگئی ہے اور ہم نے اسے ہسپتال پہنچادیا ہے۔ اس نے ہم سے کہا تھا کہ تمہیں خبر کردیں۔ تم ابھی اسپتال چلے جاؤ اور

جا کر اس سے مل لو۔"

نور الدین۔ "اماں کو کیا ہو گیا؟"

محمد عمر۔ "ڈاکٹر کہتا تھا کہ اس کے پھیپڑوں پر ورم آ گیا ہے۔ اور اسکی حالت بہت خراب ہے۔"

ماں کی ناگہانی علالت کی خبر نے نور الدین کے دل کو تکلیف پہنچائی اور یہ واقعہ ہے کہ یہ تکلیف اسے اس سبب سے نہیں ہوئی کہ آیندہ روٹیوں کا سہارا جاتا نظر آیا تھا۔ بلکہ صرف اس لیے کہ فی الحقیقت اسے ماں سے ایک گونہ محبت تھی۔ کلکتہ کے جغرافیہ سے وہ بخوبی واقف تھا۔ اس لیے وہ بلا کسی دقت کے سیدھا اسپتال پہنچا۔ اور ماں سے ملا۔ بڑھیا شدید تکلیف میں مبتلا تھی اور سانس بھی بدشواری لے سکتی تھی۔ بیٹے کو دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشی اور اطمینان کے آثار پیدا ہوئے۔ اور اس نے بالکل اپنے معمولی لہجہ میں کہا

بڑھیا۔ "نورا بیٹا، دیکھو تمام دنیا تمہارے سامنے پڑی ہے محنت کرو اور بڑے آدمی بن جاؤ۔ چوری کبھی نہ کرنا۔ جاؤ بس اب یہاں مت آنا۔ میں اب اچھی نہیں ہو سکتی۔ خدا تمہیں فیل نشین کرے۔ آخری جملہ کہتے وقت بڑھیا کی آواز کسی قدر تھرتھرائی۔ اور اس کی آنکھوں میں بھی کچھ نمی سی نمودار ہوئی۔ لیکن اتنا کہکر اس نے اپنا مُنھ دوسری طرف کو پھیر لیا۔ اور نور الدین کسی قدر اُداسی اور رنج کی حالت میں وہاں سے چلا آیا۔

"ابے نورا ہم نے تُس سے رنج سے) دسیوں دفعہ کہا کہ اتنا بہت سا کام

مت کیا کر۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا، تیرے مارے (تیری وجہ سے) ہمیں بھی سب کو اتنا ہی کام کرنا پڑتا ہے۔"

نورالدین گودی پر جہاز سے مال اُتارنے میں مصروف تھا کہ یہ الفاظ ایک پرانے خلاصی نے اس سے کہے

نورالدین۔ "مجھ سے تو جتنی محنت ہو سکتی ہے اتنی کرونگا۔ تم سے نہیں ہو سکتی تم مت کرو۔"

خلاصی۔ "ابے پاگل بیوقوف۔ دن بھر میں تو پچاس بوریاں اُٹھائیگا تب بھی اتنے ہی پیسے ملیں گے اور بیس اُٹھائیگا تب بھی اتنے ہی ملیں گے۔ پھر خواہ مخواہ کو اپنی جان کیوں ہلکان کرتا ہے؟"

نورالدین۔ "اماں نے کہا تھا کہ محنت کرنے سے میں بڑا آدمی بن جاؤں گا"

خلاصی۔ "ابے گدھے کہیں قلی بھی بڑے آدمی بنے ہیں۔ بڑا آدمی بننے کا شوق تھا تو کچھ لکھا پڑھا ہوتا۔ اور کسی دفتر کا بابو ہوتا۔ یہاں ٹوکری ڈھونے کے لئے کیوں آیا ہے؟"

نورالدین نے کچھ جواب نہ دیا۔ اور اسی طرح محنت سے اپنا کام کرتا رہا۔ شام کو جب اسے کام سے چھٹی ملی تو اس نے بوڑھے خلاصی کی باتوں پر غور کرنا شروع کیا۔ "بڑے آدمی بننے کے لیے پڑھنے لکھنے کی ضرورت ہے۔ سب بڑے آدمی لکھے پڑھے ہوتے ہیں۔ دفتر کا بابو بننے کے لیے انگریزی سیکھنی پڑے گی۔ اور حساب کتاب بھی سیکھنا ہوگا۔ یہ تو بڑی مشکل ہوئی۔ اچھا میں رات کو پڑھا کروں گا۔ شہر میں بہت سے

رات کے مدرسے بھی تو ہیں۔ وہیں نام لکھالوں گا۔"

نورالدین کے خیال سے عمل تک زیادہ فاصلہ نہ تھا۔ وہ اسی وقت اُٹھا اور قریب کے ایک شب مدرسہ میں اپنا نام لکھانے کے لئے پہنچا۔ ماسٹر صاحب نے اسے ہونہار دیکھ کر خوشی سے اس کا نام لکھ لیا۔ اور اسے ضروری کتابیں وغیرہ دیدیں۔ اس کے بعد سے نورالدین کا یہ دستور ہوگیا کہ دن بھر جہاز پر قلی کا کام کرتا اور رات کو مدرسہ میں جاکر سبق پڑھتا۔ اور اس حالت میں اس نے پورے دو برس گذار دیئے۔ شروع ہی سے اس نے اپنا اصول یہ رکھا تھا کہ دن بھر کی آمدنی میں سے روزانہ کچھ نہ کچھ ضرور بچا لیا کرتا اور اس طرح سال بھر میں اس کے پاس پچاس روپیہ جمع ہوگئے۔ جنہیں اس نے اپنے ماسٹر کی ہدایت کے مطابق بینک میں جمع کردیا مدرسہ کے ماسٹر صاحب اس کے حال پر بہت ہی مہربان ہوگئے تھے۔ اور بڑی کوشش اور محنت سے اسے پڑھایا کرتے تھے۔ چنانچہ دو سال کی مدت میں وہ اُردو تو اچھی طرح لکھنے پڑھنے لگا۔ اور انگریزی حساب میں بھی تھوڑی بہت دستگاہ ہوگئی۔ اس عرصہ میں اس نے کئی جہازوں کے خلاصیوں اور دوسرے ملازموں سے ملاقات پیدا کرلی تھی۔ اور آخر وہ ایک روز ایک جہاز کے کپتان کے سامنے ملازمت کی غرض سے جاکر کھڑا ہو ہی گیا اب اس کی عمر پندرہ سال کی تھی۔ لیکن اس کے ہاتھ پاؤں ایسے مضبوط اور اس کا قد اتنا لمبا تھا کہ اٹھارہ اُنیس سال کا نوجوان معلوم ہوتا تھا۔ کپتان فریزر نے اپنی نیم مخمور نگاہیں اُٹھا کر اسے دیکھا۔ اور اس کے طاقت ور عضلات

کو دیکھ کر خوش ہوئے اور اسے نوکر رکھ لیا۔

جہاز کی ملازمت نے اسے دنیا کے تمام مشہور ملکوں کی سیر کرادی اور اس چھوٹی ہی سی عمر میں وہ بہت جہاں دیدہ اور تجربہ کار بن گیا۔ انتہائی شوق اور محنت سے کام کرنا اور ہمیشہ اپنی آمدنی کا ایک معقول حصہ پس انداز کرتے رہنا، اب بھی اس کا معمول تھا۔ اور جہاز کی ملازمت کے تین سال میں صرف دو مرتبہ اس نے یہ فضول خرچی کی تھی کہ بائسکوپ کا تماشہ دیکھنے چلا گیا تھا۔ اس کی محنت اور اچھی کارگذاری کی وجہ سے اس کی تنخواہ بھی بڑھادی گئی تھی۔ اور تین برس بعد جب وہ کپتان صاحب سے رخصت ہونے لگا تو اس کے پورے ایک ہزار روپیہ بینک میں جمع تھے۔ کپتان فریزر کو اس سے ایک گونہ اُنس ہو گیا تھا۔ اور اُنھوں نے اس سے کہا

فریزر۔ "ول تم نوکری کیوں چھوڑتا ہے"

نورالدین۔ "اب سمندر کی سیر سے جی بھر گیا اور میں شہر میں رہنا چاہتا ہوں"

فریزر۔ شہر میں رہ کر تم کیا کرے گا۔ وہاں تو تم خراب ہو جائیگا"

نورالدین"۔ جہاز میں رہ کر میں بڑا آدمی نہیں بن سکتا اور میں ایک بڑا آدمی بننا چاہتا ہوں"

جہاز میں رہ کر نورالدین نے تجارتی مال کی درآمد اور برآمد کا بڑے غور سے مطالعہ کیا تھا۔ اور ان معاملات میں اب اس کی معلومات کسی بڑی سے بڑی تجارتی کمپنی کے مینجر سے کسی طرح کم نہ تھی۔ تجارت کے متعلق تمام ضروری حساب کتاب وہ اچھی طرح جانتا تھا، اور شرح تبادلہ کا مطلب

اور اس کی وجہ سے نفع اور نقصان ہونے کو خوب سمجھتا تھا۔ انگریزی اب بے تکلف بولتا تھا۔ اور لکھنے سے بھی عاجز نہ تھا۔ اس کی عمر اب اٹھارہ سال کی ہو چکی تھی۔ اور اس کی تندرستی اور ہاتھ پاؤں کی مضبوطی نوجوانوں کے لیے قابلِ رشک تھی۔

سمندر اور جہاز کو ہمیشہ کے لئے الوداع کہہ کر وہ کلکتہ میں حاجی موسیٰ بھائی عبدل جی کی کمپنی میں پہنچا۔ جو شہر کے ایک نہایت کامیاب اور خوش حال تاجر تھے۔ حاجی موسیٰ بھائی کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔ اور ان کی کمپنی کی تمام ترقی اور سرسبزی صرف انہی کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ شکل وصورت کے اعتبار سے بھی حاجی صاحب ایک بڑے شاندار آدمی تھے۔ اور مستقل مزاجی عقلمندی اور ایمانداری ان کے بشرہ سے عیاں تھی۔ نورالدین کو انہوں نے سر سے پاؤں تک بڑے غور سے دیکھا اور بولے۔

حاجی موسیٰ۔ "کیا نوکری کی تلاش ہے؟"

نورالدین۔ "جی ہاں"۔

حاجی موسیٰ۔ "کیا کام کر سکتے ہو"۔

نورالدین۔ "جو کام بھی آپ سپرد کریں"۔

حاجی موسیٰ۔ "ہمارے ہاں بالفعل کوئی بڑی جگہ تو خالی نہیں ہے اور نہ کوئی بڑی جگہ بے جانے بوجھے نئے آدمی کو دی جا سکتی ہے۔ اگر تم پسند کرو تو پچیس روپیہ مہینے کی ایک محرر کی جگہ ہے۔ وہ تمہیں مل سکتی ہے"۔

نورالدین۔ پاؤں جمانے کے لئے وہی بالکل کافی ہے۔ میرا کام خود ہی آگے

چل کر مجھے ترقی دلا دیگا۔"

حاجی موسیٰ۔ اس جواب سے خوش ہوئے اور اُنھوں نے پھر ایک مرتبہ سر سے پاؤں تک نورالدین کو دیکھا اور کسی قدر خوش ہوکر بولے۔

حاجی موسیٰ۔ "ہاں یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ اگر تم کلکتہ کی خراب صحبتوں سے بچے رہے"

نورالدین۔ (ہنس کر) "مجھے ایک بڑا آدمی بننے کی تمنا ہے۔ اور بڑے آدمی ذلیل صحبتوں میں کبھی نہیں بیٹھتے۔ آپ مجھے میرا کام بتا دیجئے۔ اور باقی سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیجئے۔"

حاجی صاحب نے مینجر کو بلا کر نورالدین کو ان کے سپرد کیا۔ اور کہدیا کہ خطوط کے اندراج کا کام اس سے لیا کریں۔ حاجی صاحب کو نورالدین کی بے تکلفانہ اور بیباکانہ ادا بہت پسند آئی تھی اور اُنھوں نے برابر اس کے کام پر نگاہ رکھی انہیں معلوم ہوا کہ فی الحقیقت نورالدین بہت ہی محنتی اور کام کرنے کا شائق نوجوان تھا۔ اُسے خالی بیٹھنا کبھی گوارا نہ ہوتا تھا۔ اور تقریباً روزانہ وہ اپنا کام ختم کرنے کے بعد دوسرے محرروں کو اور مینجروں کو ان کے کام میں مدد دیتا رہتا تھا۔ جہاز کی ملازمت کے زمانہ میں اس نے جو سیاحت کی تھی، وہ بھی کمپنی کے لئے بہت کچھ مفید مطلب تھی۔ اور چند ہی روز بعد ایسا ہونے لگا کہ غیر ملکی معاملات کے متعلق حاجی صاحب اس سے مشورہ لیتے اور اس کے مطالعہ سے فائدہ اُٹھانے لگے۔ صرف چھ مہینے کی مختصر مدت میں اس کی تنخواہ پچاس روپیہ کر دی گئی۔ اور اب وہ مینجر کے بعد کمپنی کا سب سے زیادہ ضروری اور کار آمد ملازم تھا۔

ایک روز نورالدین حاجی صاحب کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ کہ یکا یک سامنے سڑک پر ایک بہت ہی شاندار رولس رائس موٹر کار گذری اور نورالدین بڑے اشتیاق کی نظروں سے اسے دیکھتا رہگیا۔ اس کا اشتیاق کچھ اس قدر نمایاں تھا کہ حاجی صاحب نے اس سے پوچھا

حاجی صاحب۔ (مسکرا کر) "کیا تم بھی ایسی موٹر خریدو گے؟"

نورالدین۔ (متانت اور سنجیدگی کے ساتھ) "اس کا رنگ مجھے پسند نہیں ہے۔ ورنہ اور ہر لحاظ سے یہ گاڑی بہت اچھی ہے۔"

حاجی صاحب۔ (خوش طبعی سے) "تو پھر کب تک خریدنے کا ارادہ ہے؟"

نورالدین۔ (نہایت سنجیدگی سے) "ابھی تو میرے پاس کافی روپیہ نہیں ہے مگر میں خریدوں گا ضرور"

نورالدین کو حاجی صاحب کی کمپنی میں کام کرتے پانچ سال گذر گئے اور اس دوران میں اس کی تنخواہ بھی بڑھتے بڑھتے سو روپیہ ماہانہ تک پہنچ گئی۔ کمپنی کے کاروبار کا وہ ایک نہایت ہی اچھا ماہر بن گیا۔ اور حاجی صاحب کو اب اس کی ایمانداری اور اس کی عقل مندی پر سب سے زیادہ بھروسہ تھا۔

حاجی موسیٰ کی کمپنی کا منیجر ایک ضعیف العمر شخص تھا جس کی عمر کا بہت سا حصہ اسی کمپنی کی ملازمت میں گذر چکا تھا۔ اپنی جوانی کے زمانہ میں وہ ایک اچھا محنتی اور ہوشیار کام کرنے والا آدمی تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ اس نے حاجی صاحب جیسے مردم شناس شخص کی نگاہوں میں عزت حاصل کرلی تھی۔ لیکن اب کچھ

عرصہ سے اس کے قویٰ برابر انحطاط کا ثبوت دے رہے تھے۔ اسے اپنے
کام سے وہ اگلی سی دلچسپی نہ رہی تھی۔ اور اب اکثر معاملات میں اس کی رائے
بھی بہت زیادہ صحیح نہ ہوتی تھی۔ عصبی کمزوری نے اسے کچھ چڑچڑا اور بدمزاج
بھی بنا دیا تھا۔ اور اب وہ کام سے بھی کبھی نہ کسی حد تک بھاگنے لگا تھا۔
بے وجہ اور بے سبب غیر حاضر ہو جانا بھی اب اس کی عادت سی ہو چلی تھی۔
اور بات بات میں آنکھوں میں آنسو بھر لانا اور اپنی خانگی مشکلات کا دکھڑا لوگوں
کو سنانے لگنا بھی اس کا معمول بن گیا تھا۔

حاجی صاحب بہت نیک اور اچھے آدمی تھے۔ لیکن ساتھ ہی وہ کاروبار
کے معاملہ میں بیحد سخت گیر بھی تھے۔ اور انہیں کسی طرح بھی خوشی سے یہ گوارا
نہ ہو سکتا تھا کہ ہر مہینے ڈھائی سو روپے ایک ایسے شخص کی تنخواہ پر صرف
ہو جایا کریں۔ جس کا کام کمپنی کے لئے ذرا بھی مفید نہ ہو۔ انہیں اب اپنے
منیجر مسٹر حفظ الکریم سے کسی قدر نفرت ہو چلی تھی۔ اور اگر وہ اس قدر نیک نہ
ہوتے تو انہیں اب تک کبھی کا علیحدہ کر چکے ہوتے۔ نورالدین کی بڑھتی
ہوئی ہر دلعزیزی اور حاجی صاحب کی منیجر سے نفرت ایسی چیزیں نہ تھیں کہ
پوشیدہ رہتیں تمام دفتر والے اور خود حفظ الکریم بھی اچھی طرح سمجھتے تھے
کہ بس امروز فردا میں منیجری کی کرسی پر نورالدین بیٹھنے والا ہے۔

حفظ الکریم کا کنبہ اچھا خاصہ بڑا تھا۔ اور کچھ تو کنبہ کے بڑے ہونے
کی وجہ سے اور کچھ اپنی ناعاقبت اندیشی کے باعث اُنہوں نے کچھ روپیہ بھی
پس انداز نہیں کیا تھا۔ کہ اس عمر میں اُن کے کام آئے۔ حاجی

صاحب کی روز افزوں نفرت اور ناراضی نے انہیں بجد پریشان کر دیا تھا اور اب وہ ہر وقت اسی فکر میں کھوئے ہوئے رہتے تھے کہ اگر ملازمت سے الگ کر دیئے گئے تو کیا کریں گے۔ پریشانی اور بدحواسی میں انسان اکثر غلطیاں کیا کرتا ہے۔ بیچارے حفظ الکریم سے بھی ایک دن اپنے کام میں بہت سخت غلطی ہو گئی۔ اور اب انہیں یقین ہو گیا کہ اس غلطی کو حاجی صاحب ہرگز معاف نہ کریں گے۔ اور ضرور برخاست کر دیں گے۔ وہ اپنی میز پر سر جھکائے بہت ہی مغموم اور اُداس بیٹھے تھے اور گو عادتاً کبھی کبھی ایک آدھ کتاب اُدھر سے اُٹھا کر ادھر رکھ دیتے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نو بجے صبح سے بارہ بجے تک وہ ذرا سا بھی کوئی کام نہ کر سکے تھے۔

نورالدین برابر صبح سے ان کی یہ حالت دیکھ رہا تھا۔ اور آخر بارہ بجے کے قریب جب اسے اپنے کام سے کچھ فرصت ملی، تو اس نے جا کر حفظ الکریم سے پوچھا۔

نورالدین ۔ "منیجر صاحب آج آپ اس قدر سست کیوں ہیں؟"

حفظ الکریم نے کسی قدر بُری نگاہوں سے اُسے دیکھا اور کہا۔

حفظ الکریم ۔ "میاں خدا کسی کو مصیبت میں نہ ڈالے۔ میں اُداس ہوں تو تعجب کیا ہے۔ مجھے فکر اور پریشانی کیا کم ہے۔"

نورالدین ۔ "کیا کوئی خاص بات ہے؟"

حفظ الکریم ۔ "تم اس بات سے ناواقف تو نہ ہوگے کہ حاجی صاحب مجھ سے ناراض ہیں۔ اور عنقریب مجھے الگ کر کے تمہیں میری جگہ دینے والے ہیں۔"

نورالدین۔ "جی ہاں مجھے معلوم تو ہے"۔
حفظ الکریم۔ "تو پھر تم خود ہی سمجھ سکتے ہو کہ میری پریشانی کا کیا باعث ہے۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ اور سب ملا کر دس آدمیوں کا کنبہ ہے۔ اس ضعیفی کی عمر میں اب کسی دوسری جگہ نوکری ملنی ناممکن ہے، کوئی اور کام مجھے آتا نہیں۔ اور روپیہ بھی میرے پاس نہیں ہے۔ کہ اس سے کوئی چھوٹی موٹی دوکان ہی کر لوں۔ تم اگر ایسی حالت میں ہوتے تو کیا پریشان نہ ہوتے"۔

نورالدین کی آنکھوں کے سامنے اپنے بچپن کا زمانہ آگیا جب اس کی ماں زندہ تھی۔ اور انہیں بمشکل پیٹ بھر روٹی میسر آتی تھی وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اور بہت دیر تک وہیں کھڑا ہوا کچھ سوچتا رہا۔ حفظ الکریم کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور ضبط کی انتہائی کوششوں کے باوجود انہیں کئی مرتبہ اپنی عینک اُتار کر اس کے شیشے اور اپنی آنکھیں پونچھنی پڑیں۔ اسی طرح مغموم و متفکر نورالدین وہاں سے اپنی میز پر جا بیٹھا۔ اور پھر بہت دیر تک کسی گہری فکر میں مبتلا رہا۔ بار بار اسے یہ حدیث کہ خیر الناس من ینفع الناس (یعنی وہ شخص سب سے اچھا ہے جو دوسروں کو فائدہ پہنچائے۔) یاد آتی تھی۔ جو اس نے مولانا ابراہیم سے ان کے وعظ میں سنی تھی۔ اور پھر رہ رہ کر اسے اپنے درخشاں مستقبل کا خیال آتا تھا۔ بالآخر اس نے کسی قدر آواز سے کہا کہ خود نقصان

اُٹھائے بغیر دوسروں کو نفع نہیں پہنچایا جا سکتا اور دوسروں کی خدمت کیے بغیر کوئی شخص بڑا اور اچھا آدمی نہیں بن سکتا۔"

اس نے قلم اُٹھا کر ایک کاغذ پر کچھ لکھا اور چپراسی کو بلا کر اسے ایک لفافہ دیا کہ حاجی موسیٰ بھائی کو دیدے۔ چند لمحوں کے بعد وہ چپراسی واپس آیا اور کہا کہ " حاجی صاحب نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔"

نورالدین اپنی اسی بے تکلفی کی چال سے حاجی صاحب کے کمرہ میں گیا تو حاجی صاحب نے گھبراہٹ میں پورا مُنھ کھول کر کہا۔

حاجی صاحب۔ " یہ تم نے کیا لکھا ہے؟"

نورالدین۔ " میں استعفا دینا چاہتا ہوں۔"

حاجی صاحب۔ " کیوں؟"

نورالدین۔ " میری تمنّا ہے کہ بڑا آدمی بن جاؤں۔"

حاجی صاحب۔ " نورالدین۔ تم غلطی کر رہے ہو۔ اور شاید تمہیں معلوم نہیں ہے کہ میں پہلی تاریخ سے تمہیں اس کمپنی کی مینجری دینے والا ہوں"

نورالدین۔ " مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ لیکن میں پھر بھی استعفا ہی دینا چاہتا ہوں۔"

حاجی صاحب۔ " نوجوانوں کی باتیں بوڑھوں کی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہیں میرا خیال ہے کہ اتنے عرصہ میں میں نے اگر تمہیں غلطی کرتے دیکھا ہے تو صرف اسی معاملہ میں دیکھا ہے۔ بہرحال میں تمہیں روکنا نہیں چاہتا اور میری دعا ہے کہ خدا تمہیں کامیاب کرے۔ لیکن اگر خدانخواستہ

تم ناکام رہو، تو پھر تم میرے پاس آ سکتے ہو۔ اس کمپنی میں تمہیں ہر وقت جگہ مل سکیگی"۔

نور الدین نے شکریہ ادا کیا اور اپنی میز پر جانے سے پہلے اس نے حفظ الکریم کو اطمینان دلا دیا کہ اب ان کی ملازمت خطرہ میں نہیں ہے

نور الدین کے پاس بہت بڑا سرمایہ نہ تھا۔ لیکن تجارتی اصولوں سے واقفیت اور موقع شناسی اس میں بدرجہ کمال موجود تھی۔ اس نے کلکتہ ہی میں کاروبار شروع کیا اور آہستہ آہستہ مگر مستقل طور پر برابر ترقی کرتا چلا گیا۔ پانچسال کی مسلسل کوششوں کے بعد وہ ایک بہت بڑی تجارتی کوٹھی کا مالک تھا۔ جو بہت ہی اعلیٰ پیمانہ پر بیرون ہند کی بہت سی کمپنیوں سے لین دین کیا کرتی تھی۔ کئی لاکھ روپیہ صرف کرکے اس نے ایک عالیشان کوٹھی اپنے رہنے کے لئے خرید لی تھی۔ جس کے احاطے میں ایک فیل خانہ بنوایا گیا تھا۔ اسے یاد تھا کہ اس کی ماں نے مرتے وقت یہ خواہش کی تھی کہ خدا اسے فیل نشین کرے۔

اس لئے اس نے دو نہایت ہی بیش قیمت ہاتھی خرید کر پال لئے تھے۔

موٹریں اب اس کے پاس ایک چھوڑ کئی تھیں۔ اور لوگوں کا خیال تھا کہ وہ کلکتہ کے متمول ترین تاجروں

میں سے ایک ہے۔ کبھی کبھی اُسے اپنی غربت کا زمانہ یاد آتا تھا۔ اور وہ بڑی حسرت کے ساتھ کہا کرتا تھا کہ کاش اس وقت اماں زندہ ہوتیں۔ شہر کے بڑے سے بڑے آدمی اس کی ملاقات کو اپنے لئے باعثِ فخر خیال کیا کرتے تھے۔ امرا اور رؤسا اپنے جلسوں اور اپنی محفلوں میں اس کی موجودگی کو وجہ زینت سمجھتے تھے۔ اس کی کوٹھی۔ اس کے باغ۔ اس کی موٹروں اور اس کے نفیس لباس کا ہر دولت مند کی زبان پر چرچا رہتا تھا۔ اور بڑے سے بڑے نواب اپنی لڑکیوں کو دیکھ کر یہ تمنا کیا کرتے تھے کہ کوئی صورت ایسی نکلتی کہ ان میں سے کسی کی شادی نورالدین کے ساتھ ہو جاتی

کاروبار کے حسب مراد ترقی پا جانے کے بعد نورالدین کو خود بھی کبھی کبھی شادی کا خیال آتا تھا۔ اور بعض اوقات اس کے احباب بھی اس قسم کی تحریک کرتے رہتے تھے۔ لیکن ایک پیدائشی اور پکا تاجر ہونے کی وجہ سے اُسے یہ گوارا نہ تھا کہ بے دیکھے بھالے صرف دوسروں سے حالات سن کر وہ کسی لڑکی کو اپنی زندگی کا شریک بنالے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ جب اسلام اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کو دیکھ لیں اور جناب رسول مقبول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی تاکید فرمائی ہے کہ لڑکی کو دیکھ لیا جائے، تو پھر میں اس فضول اور بیہودہ رسم کی پابندی

کیوں کروں ؟

کلکتہ میں نواب نجم الہدیٰ ایک بہت ہی معزز نواب تھے ان کے آباؤ اجداد شاہجہاں کے عہد حکومت میں ایران سے آئے تھے اور عرصہ تک بنگال کی صوبہ داری ان کے خاندان میں رہ چکی تھی۔ نوابوں کا یہ خاندان اگرچہ ایک بہت بڑی حد تک تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ پھر بھی نجم الہدیٰ کے والد اتنا ضرور چھوڑ مرے تھے کہ اگر یہ چلن سے چلتے تو نہایت عیش کے ساتھ اپنی زندگی بسر کر کے بہت کچھ اولاد کے لئے بھی چھوڑ جاتے۔ لیکن نجم الہدیٰ نے باپ کے مرتے ہی کچھ ایسے ہاتھ پاؤں نکالے اور اس قدر فضول خرچی شروع کی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں جائداد کا کچھ حصہ فروخت اور بہت سا رہن ہو گیا۔ اپنی آمدنی سے بہت زیادہ صرف کر دینا اور صرف نوابی کی شان دکھانے کے لئے ہزاروں روپے لُٹا دینا ان کا شروع سے معمول رہا تھا۔ اور اپنی اسی وضع پر وہ اب بھی بہت مضبوطی سے قائم تھے۔ نواب صاحب نورالدین سے اچھی طرح واقف تھے۔ اور بار بار ان کے دل میں یہ خیال آ چکا تھا کہ اپنی اکلوتی بیٹی نجم النساء بیگم کی شادی اس کے ساتھ کر دیں۔ خفیہ طور پر انہوں نے اپنے احباب کے ذریعہ سے نورالدین کا عندیہ معلوم کیا۔ اور جب انہیں معلوم ہوا کہ وہ لڑکی کو دیکھے بغیر شادی کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، تو پہلے تو وہ مایوس ہو کر بیٹھ رہے۔ مگر بعد میں جب لوگوں

نے انہیں سمجھایا کہ اسلام نے اس کی اجازت دی ہے۔ تو رضا مند ہو گئے۔ منہ دکھائی کا ایک نہایت مناسب طریقہ وضع کیا گیا۔ اور فریقین نے ایک دوسرے کو اچھی طرح پسند کر لیا۔

نورالدین کو نواب صاحب کے تمام حالات معلوم تھے۔ اور ان کی آمدنی بھی اس سے پوشیدہ نہ تھی۔ اور ان کے اخراجات بھی وہ خود بھی اس بات کو سمجھ گیا تھا کہ اس کی دولت اس خوش نصیبی کا باعث ہوئی ہے کہ نجمہ جیسی حسین اور عالی خاندان لڑکی کا عقد اس کے ساتھ تجویز کیا جا رہا ہے۔ اور بعض دوسرے شخصوں نے بھی اشارۃً اسی قسم کے خیالات ظاہر کئے تھے۔ جب بات چیت قریب قریب پختہ ہو گئی تو ایک روز تقریباً صاف الفاظ میں اسے یہ بھی سُنا دیا گیا کہ نواب صاحب پر جو بارہ لاکھ روپیہ کی ڈگری ہوئی ہے، وہ قرضہ اسے ادا کرنا پڑے گا۔ تاکہ ان کی باقی ماندہ جائداد قرقی سے محفوظ رہ سکے۔ شیخ شہاب الدین سے جنہوں نے اسے یہ خبر سنائی تھی اس نے کہا کہ "شیخ صاحب جس لڑکی کے لئے میں اپنی جان دے سکتا ہوں، اس کے لئے بارہ لاکھ روپیہ صرف کرنا کونسی بڑی بات ہے۔ جب کہ میرے پاس اتنی دولت موجود بھی ہو"

دن گزرنے چلے گئے اور دونوں طرف شادی کی تیاریاں خوب زور کے ساتھ ہونے لگیں۔ نورالدین کو نجم النساء کچھ اس قدر بھلی معلوم ہوتی تھی کہ اب وہ آٹھوں پہر اسی کے خیال میں مستغرق رہتا

تھا۔ نجم النساء کی تصویر اس کے پاس تھی۔ اور اس کا بیشتر وقت اسی تصویر کے دیکھنے اور اس سے باتیں کرنے میں گذرتا تھا۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ نجم النساء بھی اس کی تصویر کی اس سے کچھ کم وقعت نہیں کرتی، اور اس کی ایک سہیلی نے نورالدین کو اطلاع دی تھی کہ تنہائی میں نجمہ کا مشغلہ بھی تصویر پرستی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ نورالدین کو نجمہ سے شادی کی تمنا اس لئے نہ تھی کہ وہ ایک بہت ہی بڑے معزز خاندان سے اپنے تعلقات پیدا کرنا چاہتا تھا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ نجمہ کو دیکھنے کے بعد وہ دل و جان سے اس کا شیدا بن چکا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ اس کی خاطر وہ اپنی تمام دولت لٹا دینے کے لئے آمادہ تھا۔ بارہ لاکھ روپیہ کی رقم ایسی معمولی سی رقم نہ تھی کہ نورالدین اُسے آسانی سے نکال کر دے سکتا۔ اور اس بارہ لاکھ کے علاوہ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ دو چار ہزار روپیہ ہر مہینے اور بھی نواب صاحب کو دینے پڑا کریں گے نقد روپیہ کی صورت میں اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ اس نے مختلف کمپنیوں میں بہت سے حصے خرید رکھے تھے۔ اور خود ایک بہت ہی کامیاب بینک کے بیشتر حصوں کا مالک اور ڈائرکٹر تھا۔ اس کی تمام جائداد کی اور تمام حصوں کی مجموعی قیمت بیس لاکھ کے اندر ہی اندر تھی۔ اور تجارت میں لگی ہوئی اتنی رقم میں سے اکٹھے بارہ لاکھ الگ کر لینا گویا حقیقتاً تجارت کا ناس کر لینا تھا۔ لیکن نجمہ کی خاطر اسے اپنی یہ تباہی خوشی سے گوارا تھی۔ شادی کی تاریخ قریب آتی جا رہی تھی۔ نواب صاحب کے

تعلقات نورالدین سے روز افزوں ترقی پر تھے۔ اور قریب قریب روزانہ ہی ایسا ہوتا تھا کہ نواب صاحب، نجمہ اور نورالدین ایک ہی موٹر میں بیٹھ کر سیر کے لئے جاتے۔

نکاح میں اب صرف پندرہ دن باقی تھے کہ یکا یک ایک دن تمام شہر میں یہ خبر بجلی کی طرح دوڑ گئی کہ "انڈین انڈسٹریل بینک" کا دیوالہ نکل گیا۔ اس بینک میں نورالدین کے کچھ حِصے تھے۔ اور اس وقت اس طرح یکا یک اس کا دیوالہ نکلنے کا اسے افسوس ضرور ہوا۔ لیکن اس نے کچھ زیادہ پرواہ نہ کی تھوڑی دیر کے بعد اس کے اپنے بینک کے مینجر نے ٹیلیفون پر اس سے کہا کہ کچھ نازک حالات پیدا ہو گئے ہیں، فوراً آیئے۔ موٹر میں بیٹھ کر نورالدین فوراً بینک پہنچا۔ اور مینجر نے اس سے کہا

مینجر۔ "انڈسٹریل بینک کا دیوالہ نکلنے کی وجہ سے پبلک میں ایک عام پریشانی اور بے اطمینانی پھیل گئی ہے گھبرا گھبرا کر لوگ اپنا روپیہ ہمارے بینک سے نکالنے کے لئے بھی آ رہے ہیں۔ بینک میں اتنا روپیہ موجود نہیں ہے کہ اتنے بہت سے مطالبات ادا کئے جا سکیں اب آپ کے لئے صرف یہی ایک صورت مناسب ہے کہ آپ بھی دیوالہ نکال دیں۔"

نورالدین۔ "کیا؟ دیوالہ! کیوں میں دیوالہ کیوں نکالدوں؟"

مینجر۔ "دوسری صورت یہ ہے کہ فوراً چودہ لاکھ کے قریب روپیہ کا

انتظام کیجئے اور میں جانتا ہوں کہ اس وقت یہ ناممکن ہے۔ پانچ لاکھ کے قریب آپ کا روپیہ انڈسٹریل بینک میں ڈوب گیا۔ اور جو صورت حالات پیدا ہوگئی ہے اسے دیکھ کر کوئی آپ کو قرض بھی نہ دیگا۔ اگر آپ دیوالہ نکال دیں تو خود تباہ ہونے سے بچ سکتے ہیں"
نورالدین "لیکن اس کے تو یہ معنی ہوں گے کہ بہت سے گھر تباہ ہوجائیں۔ بینک میں ہزاروں ایسے آدمیوں کا روپیہ جمع ہے، جن کے پاس اس کے علاوہ ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ اور بہت سے بڈھوں کی عمر بھر کی کمائی اس میں محفوظ ہے۔ نہ معلوم کتنی بیوائیں اور کتنے یتیم بچوں کا تمام اثاثہ صرف وہی رقم ہے۔ جو ان کے نام سے اس بینک میں جمع ہے۔ اور تم مجھے یہ مشورہ دے رہے ہو، کہ ان سب کو ان کے جائز حقوق سے محروم کر کے میں دیوالہ نکال دوں"
منیجر۔ تمام دنیا یہی کیا کرتی ہے۔ آپ کا اس میں قصور بھی کیا ہے آپ کی تو یہ خواہش نہ تھی کہ لوگوں کا روپیہ ہضم کر کے بیٹھ رہیں۔ لوگ خود ہی بیوقوف ہوجائیں اور بے اعتباری کی وجہ سے اپنا تمام روپیہ بیک وقت بینک سے نکال لینا چاہیں۔ تو ایسی صورت میں آخر بینک کیا کرے۔ دوسروں کے گھروں کو تباہ کرنا آپ کا منشا، ہرگز نہ تھا لیکن اپنے گھر کو تباہی سے بچانے کے لئے اگر آپ کے ہاتھوں سے بعض گھر تباہ ہوجائیں، تو آپ پر کوئی الزام نہیں آتا"۔
نورالدین۔ اچھا آپ مسٹر بنرجی کو ٹیلیفون کیجئے۔ کہ ان کے فوری

مشورہ کی ضرورت ہے ذرا یہاں تشریف لے آئیں۔

ٹیلیفون کیا گیا اور بنرجی بابو جو ایک مشہور بیرسٹر تھے آئے نورالدین نے نہایت مختصر طور پر حالات بیان کئے اور کہا کہ ازراہ کرم آپ فوراً میرا مکان۔ میری موٹریں۔ میرے ہاتھی اور جس قدر میرے حصے دوسری کمپنیوں میں ہیں سب فروخت کر دیجئے۔ ہمارے ذمہ چودہ لاکھ کا مطالبہ ہے۔ اور غالباً یہ سب چیزیں قریب قریب اتنے ہی کو بک جائیں گی۔

بنرجی (حیرت سے) "آپ کیوں ایسی غلطی کر رہے ہیں۔ آپ بڑی آسانی سے دیوالہ نکال سکتے ہیں"

نورالدین۔ "دیوالہ نکالنے کی صورت میں اور صدہا گھر تباہ ہو جائیں گے"۔

بنرجی "دنیا میں یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ اس کے علاوہ معاف کیجئے آپ نے مجھ سے اپنی شادی کے متعلق بھی ذکر کیا تھا۔ اور اس کے لئے بھی آپ کو ایک بہت بڑی رقم درکار ہوگی" شادی کا نام سنتے ہی نورالدین نے جیب میں سے اپنی پاکٹ بک نکالی اور نجمہ کی تصویر کو جو اس میں رکھی ہوئی تھی بڑے غور سے دیکھا۔ اس وقت تک اسے نجمہ کا اور اپنی شادی کا خیال ہی نہ آیا تھا۔ اُسے یاد آیا کہ اس کی شادی صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ وہ بارہ لاکھ روپیہ نواب صاحب کی خدمت میں پیش کرے۔ اگر اس نے بنک کے مطالبات ادا کئے تو اس کے پاس کچھ بھی نہ رہے گا۔ بلکہ پھر وہ اس

قابل بھی نہ ہوگا کہ اگر نواب صاحب کو کچھ بھی نہ دینا پڑے، تب بھی
ایک عالی خاندان لڑکی کے معمولی اخراجات کا بار اُٹھا سکے۔ دونوں
میں سے صرف ایک ہی کام ہوسکتا ہے۔ یا تو نجمہ کے ساتھ شادی ہی
کرلی جائے۔ یا بہت سے خاندانوں کو تباہی اور بربادی سے بچالیا جائے
نجمہ کی بھولی بھولی اور دلفریب صورت اس کی ہمراہی میں گذارے
ہوئے بہت سے یاد آنے والے لمحے اس کی پیاری پیاری باتیں
اس کی دلکش آواز اور اس کی معصومانہ ادائیں سب پیش نظر تھیں۔
اور حق یہ ہے کہ نورالدین کو دیوانہ بنا دینے کے لیئے بالکل کافی تھیں
وہ بہت دیر تک انہی خیالات میں محو رہا اور اس بات کو بھی بالکل
بھول گیا کہ بنرجی بابو اس کے جواب کے منتظر ہیں۔ یہاں تک کہ بنرجی
نے کافی انتظار کے بعد پھر کہا۔

بنرجی "غالباً آپ نے بھی یہی فیصلہ کیا ہوگا کہ دیوالہ نکالنا ہی زیادہ
صحیح اور مناسب طریقہ ہے"

نورالدین (چونک کر) جی" ہاں میں اسی کے متعلق سوچ رہا تھا"

یکایک اس کی نظر کے سامنے بہت سے یتیموں اور بیواؤں
کی تصویر پھر گئی۔ جن میں مسلسل فاقہ کشی نے ہڈی اور چمڑے کے
سوا ذرا سا بھی گوشت نہ چھوڑا تھا۔ اور جن کے پاس مفلسی اور ناداری
کی وجہ سے تن ڈھکنے کے لیئے بجز دو ایک میلے کچیلے چیتھڑوں کے اور
کوئی کپڑا نہ تھا۔ عالمِ خیال میں اس نے دیکھا کہ بہت سے شریف صورت

اور معزز آدمی صرف اس لئے خودکشی کر رہے ہیں کہ اب ان کے پاس کوئی ذریعہ ایسا باقی نہیں رہا کہ عزت و آبرو کے ساتھ اپنی زندگی بسر کر سکیں۔ اس نے محسوس کیا کہ کئی ایک زر پرست انسان بینک میں اپنے روپیہ کے ڈوبنے کی خبر سُن کر سکتہ کے عالم میں آ گئے۔ اور ان کے قلب کی حرکت بند ہو گئی۔ دنیائے تصور کے ان نظاروں سے اس کی روح لرز گئی اور وہ ایک عالم بے اختیاری میں یہ کہنا ہی چاہتا تھا کہ "نہیں میں اتنے انسانوں کی تباہی گوارا نہیں کر سکتا" کہ یکایک پھر اس کی نظر نجمہ کی تصویر پر پڑ گئی۔ اور اس کی زبان رُک گئی۔ اس نے تصویر کو پاکٹ بک میں سے نکالا۔ آنسوؤں بھری آنکھوں سے اُسے دیکھا۔ اور پھر انتہائی تعظیم و تکریم کے ساتھ اسے بوسہ دیا اور ایک کاغذ میں لپیٹ کر لفافہ میں رکھ دیا۔

آنسو پونچھ کر نورالدین نے نہایت مضبوط آواز سے کہ جس سے عزم و استقلال ٹپکتا تھا کہا:۔

نورالدین:۔ مسٹر بینرجی میں آپ کے ہمدردانہ مشورہ کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں اس پر عمل نہیں کر سکتا۔ دوسروں کے لئے قربانی اور ایثار کئے بغیر کوئی شخص بڑا آدمی نہیں بن سکتا اور اپنے فائدہ کے لئے دوسروں کو نقصان پہنچانا چھوٹے اور ذلیل آدمیوں کے کام ہیں۔ آپ فوراً میری تمام چیزوں کو فروخت کرا دیجئے۔ میں اگر تباہ ہو جاؤں تو پرواہ نہیں۔ لیکن میں اپنے بہت سے بھائیوں کو تباہی اور بربادی

سے بچانا چاہتا ہوں۔ بس یہ میرا قطعی اور آخری فیصلہ ہے۔ جائیے۔ اور فوراً انتظامات کیجیے۔"

بنرجی سے نگاہ ملائے بغیر ہاتھ ملاکر رخصت کیا۔ اور بیٹھ کر خط لکھنے لگا۔ خط نواب نجم الہدیٰ کے نام تھا۔

"مخدومی۔ محترمی!

افسوس ہے قسمت نے میرا ساتھ نہ دیا۔ اور میرے دل کی سب سے بڑی آرزو جو عنقریب پوری ہونے والی تھی، پوری نہ ہو سکی۔ بعض ناگہانی حادثات کی وجہ سے میرا کاروبار بالکل تباہ ہوگیا۔ اور اب میں ایک مفلس اور نادار شخص ہوں۔ جسے کوئی حق نہیں ہے کہ آپ کی صاحبزادی صاحبہ کا خیال بھی دل میں لائے۔ یا اُن کی تصویر اپنے پاس رکھے۔ اس لئے بادل ناخواستہ یہ تصویر واپس کرکے مستدعی ہوں کہ ازراہ کرم آپ اب ہمیشہ کے لیے مجھے بھول جائیے۔ میرے دل کا خون ہوگیا۔ مگر دنیا میں ہزاروں لاکھوں دل اسی طرح ٹوٹتے رہتے ہیں۔

آپ کا بدنصیب خادم

نورالدین

تصویر پر دوبارہ نظر ڈالے بغیر اس نے جلدی سے لفافہ بند کرکے چپراسی کے حوالہ کر دیا۔ اس کے بعد اس نے ٹیلیفون اُٹھاکر حاجی موسیٰ بھائی کا نمبر ملایا۔

"میرا نام نورالدین ہے۔ کیا آپ حاجی موسیٰ بھائی ہیں؟"

"جی ہاں کہیئے مزاج اچھا ہے۔

وہ حاجی صاحب، کیا آپ اپنے اسی پُرانے ملازم نور الدین کو پھر اپنے ہاں نوکر رکھ سکتے ہیں؟"

"نور الدین صاحب کے لئے اس کمپنی میں ہمیشہ جگہ نکل سکتی ہے اور اگر آپ آج آجائیں، تو منیجر کی جگہ آپ کی خدمت میں پیش کیجا سکتی ہے۔ کیونکہ پُرانے منیجر صاحب پرسوں سے علیحدہ ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ تو بتایئے کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ اور کیوں آپ یہ سوال کر رہے ہیں"

"حاضر خدمت ہو کر زبانی عرض کر دونگا۔ السلام علیکم"

"وعلیکم السلام"

ہاتھی اور موٹریں بک چکیں۔ مکان فروخت ہو گیا۔ کمپنیوں کے حصے الگ کیئے جا چکے اور تیرہ لاکھ سے کچھ زائد رقم ان مطالبات کی ادائیگی میں دیدی گئی۔ جو نور الدین کے بنیک کے ذمہ تھے۔ اور اب مفلس و نادار نور الدین حاجی موسیٰ بھائی کی کمپنی میں منیجر کی کرسی پر بیٹھا ہوا مختلف کا غذات کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔ نواب نجم الہدیٰ نے اب اس کو بھی اپنے لئے کسرِ شان خیال کیا کہ اس کے خط کا جواب دیدیں۔ نور الدین کو اپنی حالت کی تبدیلی کا ذرا سا بھی رنج نہ تھا البتہ نجمہ کی یاد اس کی انتہائی کوششوں کے باوجود اس کے دل سے نہ نکل سکی۔ رات کی تنہائی میں جب کہ وہ سونے کے لئے اپنے بستر پر لیٹا تھا تو اس کے کئی کئی

گھنٹے اسی خیال میں گذر جاتے اور صرف بجمہ کے نہ ملنے کی وجہ سے
وہ اب محسوس کرنے لگا تھا کہ اس کی زندگی ناکام غم و الم سے بھری ہوئی
ہے۔ اب اسے اپنے اس دل میں، جو کبھی رنج و غم سے آشنا نہ تھا
ایک ہلکی ہلکی سی تڑپ اور ایک میٹھا میٹھا سا درد محسوس ہوا کرتا تھا۔ اور
اور کبھی کبھی اس کے چہرے پر اُداسی اور پژمردگی کی علامتیں نمایاں
ہوتی تھیں۔ تو اس کا باعث صرف بجمہ کی محبت تھی۔

حاجی موسیٰ بھائی کے دل میں نورالدین کی عزت اور محبّت، اب پہلے
سے بھی بہت زیادہ ہوگئی تھی اور وہ اسے فی الحقیقت اپنے بیٹے کی طرح
سمجھنے لگے تھے۔ حاجی صاحب کے دل میں کئی مرتبہ خیال آیا کہ یکمشت بہت
سا روپیہ نورالدین کو دے کر اس کے گذشتہ نقصانات کی کسی حد تک
تلافی کر دیں۔ لیکن وہ اس کی عزت و خودداری سے وہ اچھی طرح واقف
اور انہیں اندیشہ تھا کہ کہیں ان کے ایسا کرنے سے وہ ناراض نہ ہوجائے
بڑا آدمی بننے کا شوق نورالدین کے دل میں بدستور موجود تھا۔ اور وہ اب
بھی اپنی آمدنی کا ایک بہت ہی مختصر سا حصہ اپنی ضروریات پر صرف کیا
کرتا تھا۔ حاجی موسیٰ بھائی کی کمپنی میں آئے ہوئے اب پندرہ دن گذر چکے
تھے کہ ایک روز صبح کے وقت جب ڈاک کا ملاحظہ کر رہا تھا تو اسے اپنے
نام کا ایک خط اس میں ملا۔ حیرت کے ساتھ اس نے کئی مرتبہ پتہ کو پڑھا
کیونکہ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسے کس نے خط بھیجا ہوگا۔ وہ تین مرتبہ
اُلٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد آخرکار شوقِ تجسس غالب آیا اور اس نے

لفافہ کھول کر خط پڑھنا شروع اس میں حسب ذیل عبارت لکھی تھی۔

جناب والا! میری تصویر جو آپ نے واپس کی تھی اور آپ کا خط میری نظر سے گذرا اور میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ اس سے میرے جذبات کو سخت صدمہ پہنچا۔

کیا درحقیقت آپ کا یہ خیال تھا کہ میں آپ کے ہاتھ بیچی جا رہی تھی۔ اور کیا واقعتہً یہی سمجھ رہے ہیں کہ میں نے اس تعلق پر اپنی رضامندی کا اظہار صرف اس لئے کیا تھا کہ آپ ایک بہت بڑے متمول آدمی تھے؟

اگر آپ کا یہ خیال ہے تو سخت غلط ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ عورت اور عورت کی محبت سے قطعاً ناواقف ہیں۔ ممکن ہے کہ والد صاحب کے دل میں اس قسم کے خیالات ہوں۔ اور غالباً تھے۔ لیکن وہ میرے خیالات ہرگز نہ تھے۔ آپ کی تحریر سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ آپ نے بادل ناخواستہ میری تصویر واپس کی ہے۔ اس لئے میں پھر اُسے آپ کے پاس بھیج رہی ہوں۔ اور آپ پر یہ بھی ظاہر کرنا چاہتی ہوں کہ عورت محبت کی دنیا میں فاقے کر کے اور طرح طرح کی تکلیفیں اُٹھا کر زندگی بسر کرنے کو اس پر ترجیح دیتی ہے۔ کہ سونے اور چاندی کے ایسے سمندر میں کھیلا کرے، جہاں محبت کا گذر نہ ہو۔ میں نے اپنے گھر والوں پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ہے۔ اور صاف صاف کہد یا ہے کہ ایک کی صورت دیکھنے کے بعد اب کسی اور کی صورت دیکھنا مجھے ہرگز ہرگز

گوارا نہیں ہو سکتا۔ اور چونکہ میرا خیال ہے کہ آپ ابھی مجھے بھولے نہیں ہیں۔ اس لئے آپ کو یہ عریضہ لکھنے کی جرأت کر رہی ہوں، اگر آپ کو اب بھی میرا کچھ خیال باقی ہے تو اس تصویر کو بھی رکھئے اور پھر کسی مناسب ذریعہ سے والد صاحب سے تحریک بھی کیجئے اور غالباً میرے خیالات معلوم کرنے کے بعد وہ انکار کی جرأت نہ کر سکیں گے۔ اگر آپ مجھے بھول چکے ہیں، تو اسی وقت یہ تصویر واپس کر دیجئے۔ اور میں بھی پھر آپ کی تصویر واپس کر دوں گی۔ جس کی اب تک روزانہ پرستش کرتی ہوں۔

آپ کی خادمہ
نجم النسا

حاجی موسیٰ نے نواب صاحب سے ملاقات کر کے پھر تحریک کی کہ نورالدین کو اپنی فرزندی میں لے لیں اور یہ واقعہ ہے کہ وہ انکار نہ کر سکے۔ اور تصویر کی بجائے اصلی اور حقیقی نجمہ نورالدین کے کلبہ احزاں کے لئے باعثِ رونق بن گئی۔ نورالدین نے پھر ترقی کی اور چند سال گذرنے پر وہ پھر بڑا آدمی بن کر رہا لیکن اس کا مقولہ اب بھی یہی تھا کہ ہم صرف دوسروں کی خدمت کر کے ہی بڑے آدمی بن سکتے ہیں۔

سکون نا آشنا دل

چارپائی پر لیٹے لیٹے انگڑائی لے کر اور قریب کی میز سے سگریٹ
ا بکس اُٹھا کر منصور نے اپنے دوست سے جو کرسی پر بیٹھا ہوا تھا کہا
"بھئی زاہد میں کیا کروں؟ میرا دل کسی طرح نہیں بہلتا، لوگ
ہا کرتے ہیں کہ آدمی کے پاس دولت ہو تو پھر اس کا دل ہر وقت
وش رہتا ہے۔ میرے پاس تمہیں معلوم ہے کہ میری ضرورتوں
ے صدہا گنی زیادہ دولت موجود ہے۔ اتنی ہے کہ میں اسے اندھا دھند
ھینکتا ہوں۔ لٹاتا ہوں۔ خرچ کرتا ہوں، لیکن اس میں کوئی کمی
ہیں آتی۔ لیکن کیا میں خوش ہوں؟ توبہ! توبہ! جہاں تک میرا
یال ہے خوشی کبھی بھول کر بھی اس گھر میں قدم نہیں رکھتی۔ اور اب
ر اتو یہ یقین ہو چلا ہے کہ دولت اور خوشی کبھی ایک گھر میں جمع نہیں
و سکتیں۔ (ذرا رُک کر) میں سُنا کرتا تھا کہ جس شخص کو اچھے اور خوش
زاج دوست میسر آجائیں اسے روحانی اور دلی مسرت حاصل ہو جاتی ہے
یکن زاہد میں دیکھتا ہوں کہ میں اس معاملہ میں بھی سخت بدنصیب
وں۔ شہر کے چند منتخب اور حقیقت یہ ہے کہ بہت ہی لائق اور مخلص

دوست خدا نے مجھے مہیا کر دیئے ہیں۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ ان کی صحبت میں میرا بہت سا وقت نہایت ہی لطف کے ساتھ بسر ہو جاتا ہے۔ لیکن دل کا اطمینان اور سچی خوشی، جس کی مجھے تلاش ہے، وہ پھر بھی مجھے حاصل نہیں ہوتی۔ تمہارے اور تمہاری طرح اور سب احباب کے ساتھ میں ہنستا بولتا ہوں۔ اور آپس کی ہنسی دل لگی سے بھی کافی لطف اٹھاتا ہوں۔ مگر میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا دماغ چاہے جتنا بھی حظ اٹھائے۔ میرا دل اس سے بھی کوئی مسرت حاصل نہیں کرتا۔ تم شاید کہو گے کہ عرف عام میں جس چیز کو دل کہا جاتا ہے وہ تو انسان کا دماغ ہی ہوتا ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے اور اس حقیقت سے واقف ہونے کے بعد بھی میں یہی کہنے پر مجبور ہوں کہ میرے دماغ کی وہ کوئی چیز جسے مسرت اور شادمانی کی تلاش ہے وہ احباب کی دلچسپ صحبتوں سے بھی لطف اندوز نہیں ہوتی۔ اور میں ہر وقت کچھ ایسا محسوس کیا کرتا ہوں کہ جیسے میں کسی ریت کی چٹان پر کھڑا ہوا ہوں جس کے نیچے بہت ہی عمیق غار ہے اور وہ چٹان برابر پھیل رہی ہے۔"

زاہد۔" واقعی یہ حالت بہت ہی عجیب بھی ہے اور افسوسناک بھی اچھا کیا تفریحی کھیلوں میں بھی تمہارا دل نہیں بہلتا؟ کیا بلیرڈ یا ٹینس کھیلتے وقت بھی تمہارا دل ایسے ہی خیالات سے بھرا رہتا ہے؟"

منصور۔ جتنی دیر میں کھیل میں مصروف رہتا ہوں۔ اتنی دیر کے لئے اکثر میرا دھیان بٹا رہتا ہے۔ اور کبھی کبھی کوئی نہایت ہی اچھا ہاتھ مارنے

پر میرے دل میں بجلی کی لہر کی طرح خوشی کی ایک لہر سی آیا بھی کرتی ہے
لیکن یہ سب کچھ زیادہ سے زیادہ دو ایک سکنڈ کے لئے ہوتا ہے اور
اس کے بعد پھر میرے وہی خیالات ہوتے ہیں اور میرا وہی دماغ"

زاہد۔ "تو کھیل میں اگر تمہیں چند لمحوں کے لئے سچی مسرت حاصل ہو جاتی
ہے۔ تو پھر ایسا کیوں نہیں کرتے کہ اپنا بیشتر وقت کھیل ہی میں گذارو"

منصور۔ "بالکل فضول ہوگا۔ ہر وقت کھیلتے رہنے کا نتیجہ یہ نکلیگا کہ وہ
کھیل بھی معمولی چیز ہو جائے گی۔ اور ایسی کسی چیز میں میرے لئے کوئی
مسرت باقی نہیں رہتی، جس سے مجھے ہر وقت سابقہ رہے۔ نئی نئی
چیزوں میں میرے لئے کچھ سامان مسرت فراہم ہو جانے کا امکان
بھی ہے۔ لیکن جو کام کہ میرے لئے میرے ہر وقت کا معمول بن جائے
اس میں نہ کوئی دلکشی رہتی ہے۔ اور نہ مسرّت اصل میں سچ تو یہ ہے
زاہد! کہ میں شاید اس دنیا سے سیر ہو گیا ہوں۔

زاہد۔ ابھی تم نے دنیا کا دیکھا ہی کیا ہے جو اس سے سیری ہوگئی
ابھی تو تمہاری عمر صرف پچیس سال کی ہے"

منصور۔ "میں نے اتنی ہی عمر میں سب کچھ دیکھ لیا اور اس دنیا کا
کوئی لُطف ایسا باقی نہیں ہے۔ جو میں اچھی طرح نہ اُٹھا چکا ہوں۔
تمہیں میری پچھلی زندگی کے حالات کا علم نہیں ہے۔ میں ہمیشہ سے
ایسا پرہیزگار نہ تھا۔ میں نے تسکین قلب حاصل کرنے کے لئے مدتوں
شراب پی ہے۔ اور اس کثرت سے پی ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا شرابی

بھی میرا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ لیکن یہی دیکھا کہ یا تو قطعاً دل میں کوئی مسرت پیدا ہی نہ ہوئی! اگر کبھی ہوئی تو بس صرف چند لمحوں کے لیے۔ میں نے مدتوں اس حسن سے بھی لطف اٹھائے ہیں، جو قیمتاً بازار میں فروخت ہوتا ہے۔ اور میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اس سے کوئی مسرت پیدا ہونے کی بجائے اور الٹی بدمزگی پیدا ہوتی رہی۔ مجھے سخت حیرت تھی کہ دنیا آخر اس قدر دیوانی کیوں ہے کہ اپنا روپیہ خرچ کر کے بازاری حسن خریدا کرتی ہے۔ جس سے دل میں نفرت و حقارت کے سوا کوئی جذبہ پیدا ہی نہیں ہوتا۔ خدا ہی جانے وہ کیسی احمق طبیعتیں ہوتی ہیں جنہیں یہ معلوم ہونے کے بعد بھی کہ جو محبت ہم سے جتائی جا رہی ہے۔ یہ مصنوعی ہے اور ابھی تھوڑی دیر کے بعد جب کوئی دوسرا شخص چند روپے خرچ کرے گا تو اس سے بھی بالکل اسی طرح جتائی جائے گی۔ اس حسن سے نفرت اور بیزاری نہیں پیدا ہوتی۔"

زاہد:"مجھے تو کچھ بہت زیادہ واقفیت نہیں ہے۔ لیکن ہمیشہ یہی سنتا رہا ہوں کہ شراب اور حسینوں کی صحبت اس دنیا کی بہترین مسرتیں ہیں منصور:"بالکل غلط، قطعاً جھوٹ! شراب کی مسرت کی اصلیت صرف اس قدر ہے کہ وہ ہمارے حواسوں کو بیکار کر کے اپنا اثر شروع کرتی ہے اور اس طرح جب ہمارے حواس صحیح نہیں رہتے تو نہ غم کا صحیح احساس باقی رہتا ہے، نہ خوشی کا۔ شراب جو مسرت مہیا کرتی ہے، وہ بالکل وہی ہے جو ایک مخبوط الحواس شخص کو ہر وقت حاصل ہے۔ اور ایسی مسرت کو کم از کم میں

تو مسرت کہنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ میں تو صرف اس مسرت کو مسرت کہونگا۔ جسے میں درستی حواس کی حالت میں محسوس کروں۔ جس کے حصول کے لئے مجھے بار بار اپنے معدہ میں پگھلی ہوئی آگ نہ انڈیلنی پڑے۔ رہی حسینوں کی صحبت، تو اس کے متعلق میرا خیال ہے کہ اگر کسی حسین سے تمہیں فی الحقیقت محبت ہو جائے تو غالباً وہ ایک مسرت ہو گی کہ جس سے تمہارے قلب کو اطمینان حاصل ہو سکے۔ لیکن روپیہ کے بدلے میں خریدا ہوا حسن یا سونے چاندی کے ٹکڑوں کے معاوضہ میں حاصل کی ہوئی محبت میرے دل میں تو صرف ایک ہی جذبہ پیدا کرتی ہے اور وہ نفرت ہے۔

زاہد۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تم سکون قلب اور مسرت کا مطلب دنیا زمانے سے کسی قدر مختلف سمجھتے ہو؟"

منصور "ممکن تو سب کچھ ہے۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے، یہ واقعہ نہیں ہے۔"

زاہد "پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دنیا جن چیزوں سے مسرت حاصل کرے، اور جن چیزوں کو اطمینان قلب کا ذریعہ سمجھے تمہیں ان میں کوئی لطف ہی نہ آئے۔ بلکہ ان سے طبیعت اور بھی بدمزہ اور بے کیف ہو جائے۔"

منصور "حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں مسرت اور شادمانی ہی عنقا اور اس قدر کمیاب ہے کہ کہیں ملتی ہی نہیں۔ اس لئے مجبور ہو کر لوگ مصنوعی مسرتوں پر قناعت کر لیتے ہیں۔ ہماری محفلوں سے قہقہوں کی آوازیں

اکثر بلند ہوتی ہیں۔ لیکن تم دیکھو گے کہ وہ مسرت کی گونج سے خالی ہوتے ہیں۔ آج ہم میں سے ایک شخص بھی وہ ہنسی نہیں ہنستا جو افریقہ کا ایک حبشی کوتی ہے۔ اور اگر ظاہری تصنع کی نقاب اُتار دی جائے تو تم دیکھو گے کہ ہمارے چہرے ہنستے وقت کس قدر بھیانک اور مہیب ہوتے ہیں۔ ہماری زندگیاں از سر تا پا مصنوعی بن گئی ہیں۔ اور جب ہم کسی مصنوعی مسرت پر اپنے دس بیس پچاس روپے خرچ کر دیتے ہیں تو مجبور و ناچار ہو کر بالکل زبردستی اس سے کچھ نہ کچھ لطف اُٹھانا ہی پڑتا ہے۔ اور نہیں تو کم سے کم ایسی صورت تو ضرور ہی بنا لینی پڑتی ہے کہ گویا ہم خوب حظ حاصل کر رہے ہیں۔ تا کہ دوسرے ہمیں بیوقوف نہ خیال کریں۔ اور جس طرح ایک نووارد افغان صابن کو برفی سمجھ کر خرید لینے کے بعد "مال خود میخورم" کہہ کہہ کر کھا گیا تھا ہم بھی مصنوعی مسرتوں پر روپیہ خرچ کر چکنے کے بعد انہیں مسرتیں سمجھتے اور ان سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ میں اپنی طبیعت سے مجبور ہوں کہ ان تصنعات کو کسی حالت میں بھی حقیقت نہیں خیال کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ میرے لئے ان چیزوں میں بھی کوئی سامان تفریح نہیں ہے۔ جنہیں عرف عام میں مسرت و شادمانی کہا جاتا ہے۔"

زاہد:۔ "تمہارا یہ خیال تو صحیح ہے۔ لیکن اب کیا بھی کیا جائے۔ اسی دُنیا میں رہنا ہے۔ اور انہیں مصنوعی زندگی والے لوگوں میں عمر گذارنی ہے۔"

منصور "کئی روز سے میرے دل میں یہ خیال چکّر لگا رہا ہے کہ اس دنیا کی زندگی کو تو خوب دیکھ لیا۔ اب ذرا اس سے الگ ہو کر بھی دیکھیں کہ ان میں کیا مزہ ہے۔"

کوہستان ہمالیہ کی ان دشوار گذار وادیوں میں کہ جہاں سے دریائے گنگا نکل کر جنوب اور مشرق کی جانب مڑتا ہے۔ بالکل لبِ دریا ایک فقیر کی کٹی بنی ہوئی ہے۔ جنگل کے درختوں کی چند لکڑیاں کھڑی کر کے تقریباً کوئی بارہ گز مربع جگہ گھیر لی گئی ہے۔ اور ان پر خشک خشک گھانس پھونس ڈال کر، دھوپ اور بارش سے محفوظ رہنے کا سامان کر لیا گیا ہے۔ کٹی کے آس پاس بھی کچھ دُور تک زمین کو ہموار اور صاف کر کے مختلف قسم کے پھولوں کے پیڑ لگا دیئے گئے ہیں۔ اور اس سنسان مقام پر یہ مختصر سی انسانی آبادی کی نشانی ایسی بھلی معلوم ہوتی ہے، کہ دیکھنے والے کی نگاہیں اسی پر جم کر رہ جاتی ہیں۔ صاف ستھرے پانی کا چھوٹا سا چشمہ چھوٹے اور بڑے سنگریزوں پر بہ بہ کر اور بہت کچھ شور مچا مچا کر کہہ رہا ہے کہ میرے اس حقیر آغاز کو نہ دیکھو مجھے آگے جا کر ایک ذخار سمندر بننا ہے۔ شام کا وقت ہے، چڑیاں اونچے اونچے درختوں پر بسیرے کے لئے جمع ہو رہی ہیں، اور دُور سے جانوروں کے گلے کی گھنٹیوں کی آواز آ آ کر بتا رہی ہے کہ دن بھر جنگل میں چرتے رہنے کے بعد گاؤں کی گائیں اور بھینسیں اب واپس لوٹ رہی ہیں

کٹی کے سامنے دریا کے عین کنارے پر ایک سن رسیدہ فقیر بیٹھا ہوا سورج کی ان سنہری کرنوں کا تماشہ دیکھ رہا ہے۔ جو رخصت ہونے سے پہلے مقدس دریا میں اشنان کے لئے اُترتی ہیں اور آہستہ آہستہ نہا نہا کر غائب ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ فقیر کی صورت سے دلی مسرت کے آثار ہویدا ہیں۔ اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا تمام دُنیا کی حکومت اس وقت اسے حاصل ہے۔

اندھیرا جب زیادہ ہو چلا تو فقیر نے اپنے اس نوجوان چیلے سے جو نہایت ادب کے ساتھ اس سے تھوڑے فاصلہ پر دہنی جانب بیٹھا ہوا تھا، کہا:۔

"بچہ تو نے قدرت کے تماشے دیکھے؟ آج تو سورج کی کرنوں نے سارے دریا کو ایسا رنگ دیدیا تھا کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ پگھلا ہوا سونا بہہ رہا ہے"

چیلا:۔ "جی ہاں حضور۔ آج شام کا منظر بے حد خوبصورت تھا۔

فقیر۔ کیا اس سے بھی تیرے دل کو خوشی حاصل نہیں ہوتی؟"

چیلا۔ "ہوتی ہے۔ مگر بس تھوڑی سی دیر کے لیے"

فقیر۔ "اب اس سے بڑھ کر دل کو خوش کرنے والی چیز اور کیا ہو سکتی ہے؟"

چیلا۔ "اس میں ذرا سا بھی شک نہیں کہ قدرتی منظروں سے انسان کے دل کو سچی فرحت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن مجھے تو جس چیز کی تلاش ہے۔ وہ یہ عارضی خوشی نہیں ہے۔ بلکہ میں تو اپنے دل کے لیے دائمی سکون اور اطمینان چاہتا ہوں۔ ایسی عارضی مسرت تو اور

بھی بہت سے ذریعوں سے حاصل ہو جایا کرتی تھی۔"

فقیر۔ "ہر وقت اپنے دل کو مالک کے دھیان میں لگائے رکھو۔ تو دائمی سکون بھی حاصل ہو جائے گا۔"

چیلا۔ "اسی لئے تو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں کہ آپ کسی طرح میرے دل کو مالک کے دھیان میں لگا دیجئے۔ دنیا میں رہ کر یہ بات بہت مشکل معلوم ہوتی تھی کہ ہر وقت خدا سے لو لگی رہے۔ اسی لئے میں دُنیا کو چھوڑ کر یہاں پہاڑوں میں آیا ہوں کہ شاید کسی بزرگ کے فیض سے یہ بات حاصل ہو جائے۔

فقیر۔ (مسکرا کر) "دوسروں کے دل کو اطمینان دلانا کسی کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ ہم بس اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ تمہیں راستہ بتا دیں۔ ذکر کرنے کے جو طریقے تمہیں بتائے ہیں۔ اگر تم ان کے مطابق ذکر کرتے رہو گے تو کچھ عرصہ کے بعد تمہارے دِل کو وہ اطمینان بھی میسر آجائے گا۔ جس کی تمہیں تلاش ہے۔"

چیلا۔ "حضور نے جو طریقے بتائے ہیں برابر اُن پر عمل کر رہا ہوں لیکن خدا ہی جانتے یہ کمبخت کیسا دل ہے کہ اسے پھر بھی مسرت حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بار بار زبان سے ایک ہی لفظ کو دہرانے سے کچھ اُلجھن سی ہونے لگتی ہے۔ اور میں بڑی مشکل اور زبردستی سے وظیفہ ختم کر پاتا ہوں۔

فقیر۔ ہاں شروع میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ آہستہ آہستہ عادت ہو جائیگی۔

چیلا۔ "لیکن حضور عادت ہو جانے کے معنی تو یہ ہیں کہ خدا کا نام بار بار رٹتے رہنے سے میری طبیعت گھبرایا نہ کرے گی، اور میں آسانی سے وظیفہ پورا کر لیا کروں گا۔ مگر میرا مقصد تو وظیفے پڑھنا نہیں ہے۔ مجھے تو دل کا اطمینان درکار ہے۔ اگر زبان سے میں دس برس تک بھی کوئی ایک لفظ رٹتے جاؤں، تب بھی اس سے میرے دل کی کیفیت پر کیا اثر پڑیگا؟"

فقیر (کسی قدر جھنجلا کر) "تو پھر منصور تم یہاں ناحق آئے۔ جو چیز تم ڈھونڈھ رہے ہو، وہ تو خود میرے پاس بھی نہیں ہے۔ دنیا سے الگ ہو کر یہاں میں آکر اس لئے نہیں بیٹھا ہوں کہ میرے قبضہ میں کوئی عجیب وغریب چیز ہے۔ جسے میں دنیا سے چھپانا چاہتا ہوں۔ بلکہ صرف اس لئے کہ دنیا کے دھندوں میں پھنس کر میں مالک کو بھول جاتا تھا۔ اور اتنی کثرت کے ساتھ اس کا ذکر نہ کر سکتا تھا۔ جیسا کہ اب کر لیتا ہوں یہ میری کمزوری تھی کہ دنیا میں رہ کر دنیا سے الگ رہنا میرے لئے ممکن نہ تھا۔ اس لئے مجبور ہو کر یہاں آ بیٹھا۔ ذکر الٰہی کے طریقے مجھے معلوم تھے، وہ میں نے تمہیں تعلیم کر دیئے۔ اور اگر اس ذکر سے بھی تمہارے دل کو اطمینان نہیں ہوتا تو میں مجبور ہوں۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتا!"

منصور۔ "اچھا حضور مجھے صرف ایک بات بتا دیں۔"

فقیر۔ "وہ کیا؟"

منصور۔ "وہ یہ کہ کیا خود حضور کے دل کو اس ذکر سے اطمینان حاصل ہو گیا ہے؟"

فقیر نے ذرا غور سے منصور کی صورت دیکھی۔ اور کسی قدر توقف کے بعد کہا۔ "نہیں اطمینان جس چیز کا نام ہے، وہ تو مجھے حاصل نہیں ہے۔ لیکن میرا دل یہاں لگ ضرور گیا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ کبھی نہ کبھی مجھے اطمینان قلب بھی حاصل ضرور ہو جائے گا۔ ابھی تک ایسا نہیں ہوا ہے کہ میرا دل ذکر الٰہی میں مشغول ہو جائے جس دن یہ بات حاصل ہو گئی اسی روز یقینی طور پر مجھے اطمینان قلب بھی میسّر آ جائے گا۔"

منصور۔ "حضور نے کبھی اس بات پر بھی غور فرمایا کہ آج متواتر دس سال گذر جانے کے بعد بھی آخر حضور کو دلی اطمینان کیوں حاصل نہ ہو سکا؟"

فقیر۔ "میری حالت بالکل تمہاری طرح نہیں ہے۔ میں نے اسی کو کافی سمجھ رکھا ہے کہ اپنے وقت کا بیشتر حصّہ خدا کی یاد میں گذار لیتا ہوں۔ اس لئے میں نے کبھی اس چیز پر زیادہ غور نہیں کیا کہ اتنے عرصہ دراز کے بعد بھی مجھے سچا اطمینان کیوں حاصل نہیں ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ میرا ضمیر مجھے دنیا کو چھوڑ دینے پر ملامت کیا کرتا ہے۔ اس لئے ذکر الٰہی میں وہ کیفیت اور وہ قلبی مسرّت نہیں ملتی جیسی کہ ملنی چاہیے تھی۔"

منصور۔ "دنیا کے چھوڑنے پر آپ کا ضمیر کیوں آپ کو ملامت کرتا ہے؟ کیا یہ بھی کوئی بُری بات ہے؟"

فقیر: "یہ تو سراسر ہمارے پیدا کرنے والے کی مرضی کے خلاف ہے۔ اللہ نے تو ہمیں اس لئے پیدا کیا ہے کہ ہم دنیا میں رہیں، اور دنیا کے متعلق ہم پر جو فرائض عاید ہیں۔ انہیں بجالائیں۔ میں ان فرائض سے بھاگ کر یہاں چھپا بیٹھا ہوں پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ میرا دل مجھے ملامت نہ کرے"۔

منصور۔ (تھوڑی دیر سوچ کر) "تو پھر اب میرے لئے کیا حکم ہے۔ حضور کو تو یہ اُمید ہے کہ ایک نہ ایک دن اسی حالت میں اطمینان قلب میسر آجائے گا۔ مگر مجھے تو یہ اُمید بھی نہیں پڑتی"۔

فقیر۔ "بہتر یہی ہے کہ تم دنیا ہی میں واپس جاؤ۔ اور اگر ہو سکے تو دنیا میں رہ کر ہی دنیا کو چھوڑو۔ خدا وہیں کوئی ایسی صورت نکال دیگا کہ جس سے تمہارے دل کو چین اور اطمینان میسر آجائے۔
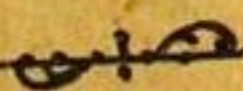
کوہ ہمالیہ کی سیاحت سے فارغ ہو کر پھر اپنے وطن میں واپس آنا اگرچہ منصور کے لئے کوئی بہت دل خوش کن کام نہ تھا۔ لیکن اپنے پیر طریقت کے حکم کی تعمیل میں اُسے آنا پڑا۔ جب وہ واپس مراد نگر پہنچا تو سردی کا موسم ختم کے قریب تھا۔ خزاں کی دستبرد نے درختوں کو پتوں سے بالکل محروم کر دیا تھا۔ اور ہر طرف ویرانی سی نظر آتی تھی۔ ابھی وہ مراد نگر سے کوئی دس میل کے فاصلہ پر تھا کہ اسے خبر ملی کہ وہاں بڑی شدت سے طاعون پھیلا ہوا ہے۔ چھوٹی سی بستی میں روزانہ دس پندرہ موتیں ہو جاتی ہیں اور لوگ گاؤں چھوڑ چھوڑ کر بھاگے جا رہے ہیں۔ منصور کے

دل میں پہلا خیال تو یہی آیا کہ وہ بھی چند روز کے لئے دہلی یا بمبئی کہیں چلا جائے۔ اور جب طاعون کا زور کم ہو تو گاؤں کا ارادہ کرے۔ لیکن اس کے غیرت مند دل نے اس خیال پر ملامت کی کہ جو لوگ رات دن محنت کرکے اس کے لئے دولت پیدا کرتے رہے ہیں۔ انہیں ان کے اس مصیبت کے وقت میں چھوڑ دے۔ اس نے اچھی طرح غور کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ مراد نگر میں جا کر رہے۔ اور جس وقت تک کہ وہاں ایک آدمی بھی باقی ہو۔ اس وقت تک گاؤں نہ چھوڑے۔ گاؤں میں پہنچکر اس کی نگاہوں نے یہ ہوش ربا نظارہ دیکھا کہ مکانات اکثر خالی پڑے ہیں۔ اور بعض بعض مکانوں میں انسانی لاشیں پڑی سڑ رہی ہیں۔ اور کوئی اٹھانے والا تک نہیں ہے۔ ہر شخص کے دل پر وہ جاہلانہ خوف طاری ہے جو انسان کو پھر کچھ کرنے ہی نہیں دیتا۔ اور جو لوگ اب تک گاؤں میں باقی ہیں ان کی بھی یہ حالت ہے کہ ڈر کے مارے گھر سے نکلتے تک نہیں۔

مراد نگر اس سے پہلے بہت ہی اچھی چھوٹی سی بستی تھی۔ اپنے سرسبز و شاداب گاؤں کی یہ حالت دیکھ کر منصور کا دل بھر آیا۔ اور بے اختیار رو دیا۔ گھر پہنچکر اس نے تھوڑی دیر تک تمام حالات پر غور کیا اور پھر گاؤں کے جو آدمی باقی تھے انہیں جمع کرکے ان کی تسلی اور تشفی کی۔ اور اس کے بعد اُن سے کہا کہ گاؤں کی آبادی سے کسی قدر فاصلہ پر چھپر کے کچھ عارضی مکانات بنا دیں تاکہ آئندہ جو کوئی بیمار ہو اُسے وہاں رکھا جا سکے۔

اپنے زمیندار کو اپنے حال پر اس قدر مہربان دیکھ کر گاؤں والوں کی بھی ڈھارس بندھی۔ اور اُسی وقت سے کام شروع کر کے اُنہوں نے ایک ہی دن میں پانچ چھ جھونپڑیاں تیار کر دیں۔

طاعون کے جو مریض موجود تھے، وہ ان جھونپڑیوں میں پہنچا دیئے گئے اور منصور نے انہی میں سے ایک جھونپڑی اپنے لئے مخصوص کر لی۔ اور اس طرح وہیں رہ کر ان مریضوں کی خدمت شروع کر دی۔ صبح سے لے کر شام تک اسے اس کے سوا اور کوئی کام نہ تھا کہ ان بیماروں کے پاس بیٹھ کر اپنی باتوں سے ان کی تسلی کرے۔ اور ضرورت کے وقت انہیں دودھ اور پانی پلاتا رہے۔ اس نے کئی ایک طبی درس گاہوں کو تار بھی دیئے کہ اگر کوئی ڈاکٹر یا نرس مراد نگر آئے اور طاعون کے مریضوں کی دیکھ بھال کرنے پر رضامند ہو تو جس تنخواہ پر بھی وہ آنا پسند کرے اسے بھیجدیں۔

بیماری ابھی بہت کافی زور پر تھی۔ اس لئے اگرچہ منصور کے انتظامات کی وجہ سے مریضوں کو بہت کچھ آرام ملنے لگا۔ لیکن بیمار ہونے کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ منصور نے جھونپڑیاں بہت کافی تعداد میں بنوالی تھیں اس لئے اس نے آس پاس کے دیہات میں بھی خبر بھیجدی تھی کہ جو کوئی بیمار ہوا کرے اسے اس کے عارضی شفاخانہ میں پہنچا دیا کریں اب تک چونکہ گھروں کے اندر مریضوں کی تیمارداری بالکل نہ ہوتی تھی، اس لئے تقریباً اسی فیصدی مریض مرجاتے تھے۔ لیکن اب جبکہ ان کی خدمت

اچھی طرح کی گئی اور انہیں باقاعدہ غذا ملتی رہی، تو بہت زیادہ اچھے ہونے لگے۔ اور منصور کے لیئے اس قدر کام بڑھ گیا کہ صبح سے رات کے ۱۲ بجے تک اُسے سر کھجلانے کی بھی مہلت نہ ملتی تھی۔ سورج نکلنے سے پہلے وہ ایک مشین کی طرح اُٹھتا اور اپنے مریضوں کی خدمت میں لگ جاتا۔ ایک بے آواز کبھی نہ تھکنے والی کل تھی، جو کبھی ایک مریض کے بستر کے پاس نظر آتی تھی اور کبھی دوسرے کے۔ سنجیدہ، متین، اور باوقار منصور اپنا ایک لمحہ بھی ضائع کیئے بغیر انتہائی انہماک کے ساتھ بیماروں کا مُنھ دھلانے انہیں دودھ پلانے اور ان کے زخموں کو دھوکر صاف کرنے میں مصروف رہتا۔ اور رات کے بارہ بجے کے قریب جب وہ اپنے بستر پر پہنچتا، تو اس قدر تھکا ہوا ہوتا کہ فوراً نیند آجاتی، اور اپنی اس نئی زندگی کے متعلق اُسے غور و فکر کا موقع بھی نہ ملتا۔

تار دینے کے پندرہ روز بعد اسے اطلاع ملی کہ صرف ایک لڑکی جو ڈاکٹری تعلیم پارہی تھی، مراد نگر آنے پر تیار ہوئی ہے۔ اور وہ اپنی اس خدمت کا کوئی معاوضہ نہیں چاہتی۔ اس خبر کے دوسرے روز اسے مس سلطانہ کی طرف سے ایک تار ملا۔ جس میں اپنی آمد کے وقت سے اطلاع دی گئی تھی۔ اور منصور نے سمجھ لیا کہ یہ وہی لڑکی ہے، جس کے متعلق میڈیکل کالج سے اسے اطلاع ملی تھی۔ منصور نے اس خیال کو کسی قدر حقارت کے ساتھ دیکھا کہ کوئی لڑکی اور وہ بھی بلا تنخواہ اس کے مریضوں کی خدمت کے لیئے آئے مگر مجبوراً سنگ آمد و سخت آمد کہہ کر

سلطانہ کو اسٹیشن سے لانے کے انتظامات کرنے پڑے۔ اس نے بہت چاہا کہ خود ہی اسے لینے کے لئے جائے۔ مگر اسے فرصت نہ مل سکتی تھی، اس لئے مجبوراً اور کچھ لوگوں کو سواری لے کر بھیج دیا۔

سلطانہ ایسی قابل نفرت اور حقیر چیز نہ ثابت ہوئی، جیسا کہ منصور نے خیال کیا تھا۔ جس طرح ماں اپنے بچوں کی خدمت کرتی ہے۔ اس طرح اس نے مریضوں کی خدمت کی۔ اور صرف دس بارہ ہی دن کے اندر منصور اسے بے حد تعظیم اور محبت کی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ سلطانہ اگر حسین نہ تھی تو بدصورت بھی نہ تھی۔ اس کی عمر تقریباً اکیس سال کی تھی اور گو الگ الگ اس کی آنکھ ناک کچھ بہت زیادہ حسین نہ ہوں لیکن بحیثیت مجموعی وہ کسی طرح بھی بدنما نہ کہی جا سکتی تھی۔

طاعون کا سلسلہ برابر جاری رہا چاروں طرف کے دیہات سے بیمار برابر اسی نئی قسم کے اسپتال میں آتے رہے اور منصور اور سلطانہ دونوں کو اس قدر کام ملتا رہا کہ کئی کئی دن تک ان میں کبھی باہم بات چیت کرنے کی بھی نوبت نہ آتی تھی۔ مریضوں میں مرد بھی تھے اور بچے عورتیں بھی۔ منصور نے آسانی کی غرض سے کام تقسیم کر لیا تھا۔ مردوں کی خدمت اس نے اپنے ذمہ لے لی، اور عورتیں اور بچے سلطانہ کے سپرد کئے۔ خدا خدا کر کے تین مہینے میں کہیں جا کر وبا کا زور کم ہوا اور نئے مریضوں کی آمد میں روز افزوں کمی آنے لگی۔ منصور کو اب اتنا موقع ملنے لگا کہ اپنے

گرد و پیش کے حالات پر غور کرے۔ اور ایک روز رات کی تنہائی میں اس نے اپنے بستر پر لیٹے لیٹے سوچنا شروع کیا۔

بیماروں کی خدمت میں کس قدر لطف آتا ہے۔ گذشتہ تین مہینوں میں میں جس قدر خوش و خرم رہا ہوں ایسا کبھی اپنی تمام عمر میں نہ رہا تھا۔ دنیا میں اس سے بڑھ کر کوئی اور خوشی نہیں ہو سکتی۔ کہ انسان اپنے کسی ناچار اور مجبور بھائی کی خدمت کرے۔ جب کوئی بیمار احسان مندی کی نگاہ سے میری طرف دیکھتا تھا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا میں نے شراب کی ایک پوری بوتل پی لی ہے بلکہ شراب میں تو کبھی یہ لطف آتا ہی نہ تھا۔ نہیں شراب میں یہ مزا کہاں۔ یہ تو سچی خوشی اور مسرت تھی۔..........

ایں! ٹھیک ہے میں بھی کس قدر دھوکے میں رہا۔ آج تک مجھے معلوم ہی نہ ہوا کہ حقیقی مسرت جس کی مجھے تلاش تھی یہی ہے۔

افوہ! آج میری سمجھ میں آیا کہ دل کا اطمینان اور سچی خوشی کس چیز کا نام ہے۔ مگر اب تو خدا کے فضل و کرم سے وبا دور ہو چلی ہے۔ اب آئندہ کیا ہو گا۔ ایک سچی مسرت حاصل کرنے کے بعد اب مجھے کیسے یہ گوارا ہو سکتا ہے کہ میں اس سے محروم ہو جاؤں.......

ہاں بس یہی مناسب ہو گا۔ یہ روپیہ آخر میرے کس کام آئے گا؟ مجھے دنیا میں اب کسی چیز کی ہوس باقی نہیں ہے۔ سلطانہ سے بھی اس کے متعلق مشورہ کر لینا بہتر ہو گا۔ اس کی رائے اس معاملہ

ہیں بہت زیادہ صحیح ہو گی۔کس قدر اچھی اور نیک لڑکی ہے۔کس قدر تندہی اور محنت سے اس نے مریضوں کی خدمت کی۔بعض وقت تو اس کے انہماک پر مجھے رشک آتا تھا۔ممکن ہے کہ اسے بھی میری ہی طرح حقیقی مسرت کی تلاش ہو۔اور میری ہی طرح اس نے اطمینان قلب یہاں آکر حاصل کیا ہو! بہت ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔وہ اپنے دل میں مجھے کیا کہتی ہو گی۔میں نے کبھی اس سے سیدھے مُنھ بات بھی نہ کی۔اچھا کل اس سے اچھی طرح باتیں کرونگا۔

دوسرے روز منصور نے سلطانہ سے پہلے تو اپنے اس برتاؤ کے متعلق معذرت کی جواب تک رہا تھا، اور پھر اِدھر اُدھر کی بہت سی باتیں کرنے کے بعد اس نے کہا:۔

منصور۔"میرا جی چاہتا ہے کہ یہاں مستقل طور پر ایک شفاخانہ بنوا دوں"

سلطانہ۔"نہایت ہی اچھا خیال ہے۔یہاں آس پاس دُور دُور تک کوئی شفاخانہ ہے بھی نہیں"۔

منصور کو سلطانہ کے جواب دینے کا انداز بہت پسند آیا اور اس نے محبت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

منصور۔"آپ ایک میڈیکل کالج میں رہتی ہیں اور غالباً اسپتال کی تعمیر اور اس کے آیندہ اخراجات کے متعلق مجھ سے بہت زیادہ صحیح اندازہ کر سکیں گی"۔

سلطانہ۔(مسکرا کر)"یہ چیزیں تو میری تعلیم میں داخل نہیں تھیں، تاہم

جہاں تک میرا خیال ہے ایک ایسا شفاخانہ کہ جس میں پچاس مریض رہ سکیں کم سے کم پچاس ساٹھ ہزار روپیہ میں بنے گا۔"

منصور۔" کیا آپ پسند کریں گی کہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اِس اسپتال کے زنانہ حصہ کی ذمہ داری قبول کریں؟"

سلطانہ۔" اگر آپ مجھے تنخواہ لینے پر مجبور نہ کریں تو میں ضرور ایسا کر سکتی ہوں۔ بلکہ کسی دوسری جگہ کام کرنے کی بہ نسبت یہاں کام کرتے میں مجھے زیادہ خوشی ہوگی۔"

منصور۔" تنخواہ کے متعلق یہ شرط بالکل غیر ضروری ہے۔"

سلطانہ۔" میں اسے سب سے زیادہ ضروری سمجھتی ہوں۔"

منصور۔ (تعجب سے) "یہ کیوں؟"

سلطانہ۔" صرف اس لئے کہ مجھے روپیہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اور یہ فن میں روپیہ کمانے کی غرض سے نہیں سیکھ رہی ہوں۔"

منصور نے کسی قدر غائر نظروں سے سلطانہ کو دیکھا۔ کھڑکی کی روشنی چھن چھن کر، اس کے چہرہ پر پڑ رہی تھی اور آفتاب کی ہلکی ہلکی تمازت کی وجہ سے اس پر بہت کافی سرخی آ گئی تھی۔ سلطانہ کا طرز و انداز سادہ تکلف اور تصنع سے یکسر خالی تھا۔ ایک سچی اور بہادر لڑکی کی طرح اس نے منصور کی متجسس نگاہ کا مقابلہ کیا۔ اور منصور کو مجبور ہو کر دل ہی دل میں یہ کہنا پڑا کہ " میں سخت غلطی پر تھا۔ یہ لڑکی تو حد سے زیادہ شریف اور نیک دل ہے"

منصور۔" آپ کو روپیہ کی ضرورت یقیناً نہ ہوگی۔ لیکن جو لطف اپنی قوت بازو

سے پیدا کی ہوئی دولت کے خرچ کرنے میں آتا ہے۔ وہ باپ دادا کے اندوختہ پر بسر اوقات کرنے میں نہیں آتا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں تو خاندانی ترکہ سے تنگ آگیا ہوں۔"

اس مرتبہ سلطانہ نے منصور پر بہت گہری نظریں ڈالنے کے بعد اپنے دل میں یہ فیصلہ کیا کہ " میں نے اس شخص کو مغرور اور خود سر خیال کیا تھا۔ مگر میری غلطی تھی۔ اس قدر نیک، ایماندار اور نوجوان ہونا مشکل ہے۔
سلطانہ (مسکراکر) " تو کیا اسی وجہ سے آپ اپنے سرمایہ کو اسپتال کی تعمیر پر خرچ کر دینا چاہتے ہیں ؟"
منصور: اصل یہ ہے کہ میری طبیعت کچھ بہت ہی عجیب قسم کی واقع ہوئی ہے۔ مدتوں سے میں اس تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا کہ کسی طرح مجھے سچی خوشی اور دل کا اطمینان حاصل ہو جائے۔ تقریباً آٹھ برس تک مسلسل جستجو کے بعد مجھے طاعون کے مریضوں کی خدمت میں سچی مسرت میسر آئی اور میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ حقیقی مسرت اگر کہیں مل سکتی ہے تو وہ خدا کے بندوں کی خدمت گذاری میں مل سکتی ہے۔
میرے پاس بزرگوں کا چھوڑا ہوا بے انتہا روپیہ ہے۔ اور اب میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اسے سب کو خلق اللہ کی بہبود و فلاح کی نذر کر دوں۔ اور خود ایک ایماندار کاشتکار کی زندگی بسر کروں۔ جو جتنا کچھ زمین کے خزانہ سے نکالتا ہے، اسی کے برابر اپنا خون پسینہ کی شکل میں زمین کو دے بھی دیتا ہے۔

سلطانہ نے منصور کو پھر بڑے غور سے دیکھا۔
"آپ کے خیالات بہت ہی شریفانہ ہیں"۔
منصور۔ یہ رائے تو میں نے آپ کے خیالات کے متعلق قائم کی تھی"۔
سلطانہ:۔ اگر آپ میری تمام جائداد بھی اپنے شفاخانہ کے لیے لے لیں تو میں بھی یہ گوارا کر سکتی ہوں کہ آپ کے اسپتال کے لئے کام کروں اور تنخواہ نہ لوں"
منصور۔"سلطانہ تم بہت ہی نیک اور شریف ہو"۔
سلطانہ۔"آپ کی طرح مجھے بھی حقیقی مسرت کی تلاش تھی۔ اور خدا کا شکر ہے کہ اب مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ وہ کہاں مل سکتی ہے"۔
منصور۔"ہم دونوں کو حقیقی مسرت کی تلاش تھی اور ہم دونوں نے اُسے پالیا۔ اب کیوں نہ ایسی کوشش کی جائے کہ ہم اطمینان قلب بھی حاصل کر لیں۔ خلق خدا کی خدمت کے لئے ہماری جائدادیں مشترک ہو رہی ہیں تو کیوں نہ خود اپنی خدمت کرنے کے لئے ہم دونوں کی زندگیاں بھی مشترک ہو جائیں۔ مجھے تو یقین ہے کہ اس صورت میں میرے دل کو کامل اطمینان حاصل ہو جائیگا"۔
سلطانہ نے شرما کر نگاہیں نیچی کر لیں۔

حسرت نصیب مزدور

سست اور کسی قدر کمزور ہاتھ سے، اس طرح کہ جیسے دل نہ چاہتا ہو، ریاض الدین نے اپنا پرانا اور میلا کوٹ کھونٹی پر سے اُتارنے کے لئے جب ہاتھ اونچا کیا۔ تو اس کی نگاہ کلائی اور بازو کی جھریوں پر پڑی جو کرتے کی آستین اوپر کو سرک جانے کی وجہ سے اب قریب قریب کندھوں تک کھل گیا تھا۔ ہاتھ اسی طرح کوٹ کا کالر پکڑے کھونٹی پر رک گیا۔ کلائی کی جھریوں پر نگاہیں جم گئیں۔ اور دیر تک ریاض الدین ضعیفی کی آمد کے اِن آثار پر غور کرتا رہا۔ اس کی نظریں کلائی پر گڑ گئی تھیں۔ لیکن اب وہ انہیں دیکھ نہیں رہا تھا۔ وہ کسی چیز کو بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ بلکہ وہ اپنی خیالی دنیا کی سیر میں مصروف تھا۔

وکالت کا پُر لطف زمانہ۔ موکلوں کا ہر وقت کا ہجوم، عدالتوں کے عالی شان کمرے۔ عدالت کے اندر اور عدالت کے باہر غیر معمولی عزت، منصفوں کے سامنے اپنی دھواں دھار اور مدلل تقریریں محض اپنی تقریر کے زور سے صدہا ایسے مقدموں کو کہ جو کافی ثبوت موجود نہ

ہونے کی وجہ سے خارج ہو جاتے۔ اپنی موافقت میں طے کرالینا عالیشان کوٹھی نایاب گھوڑے۔ اعلیٰ درجہ کی موٹریں، گھر میں سامان عیش کے انبار۔ بینکوں میں روپیہ کی افراط، غرضیکہ اپنے اچھے اور بنے ہوئے زمانہ کی ایک ایک چیز اس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ ڈور بہت فاصلہ پر یہ تمام چیزیں اسے ایک مٹے ہوئے خاکے کی طرح، دھندلی دُھندلی نظر آرہی تھیں۔ کامل سکوت اور بے حسی کے عالم میں وہ کوئی دس منٹ تک ان چیزوں کو دیکھتا رہا۔ یہانتک کہ رفتہ رفتہ خیالی اُفق کے یہ تمام نقش ونگار سمٹنے لگے۔ اور آہستہ آہستہ سمٹ کر اُنہوں نے ریاض الدین کی کلائی کی جھریوں کی صورت اختیار کرلی۔ اور اب اسے ہوش سا آگیا۔ ایک ٹھنڈا سانس بھر کر اس نے آہستہ سے کوٹ اُتارا اور دو تین مرتبہ اسے آہستہ آہستہ جھاڑا گردن نیچے کو جھکائے اُسے پہنا اور بہت ہی مغموم انداز سے رُک رُک کر کچھ سوچتا ہوا باہر کو چلا گیا۔

۱۹۱۹ء تک ریاض الدین ڈھاکہ کا سب سے زیادہ کامیاب اور سب سے زیادہ دولت مند وکیل تھا۔ اس کی آمدنی اس قدر تھی کہ اس کا شمار مشکل تھا۔ اور اسی طرح اس کا خرچ بھی اسی قدر تھا کہ اس کا اندازہ کرنا اور حساب لگانا دشوار تھا۔ تیس چالیس ہزار روپیہ ماہانہ اس کے ہاتھوں میں آتے تھے۔ اور جس طرح آتے تھے۔ اسی طرح نکل جاتے تھے۔ سچائی اور ایمانداری ریاض الدین کی خصوصیت

تھی۔ اور اس کے متعلق یہ مشہور تھا کہ اس نے جان کر کبھی کسی
جھوٹے مقدمہ کی پیروی نہیں کی۔ تمام شہر میں اس کی سچائی اور
ایمانداری کی دھوم تھی۔ اور دُور دُور تک وہ اپنی قانون دانی اور
مدلل و معقول بحث کے لیے مشہور تھا۔

سنہ ۱۹ء میں جب ملک قوم اور مذہب کی طرف سے وکیلوں
سے یہ مطالبہ ہوا کہ وہ وکالت چھوڑ دیں، تو ریاض الدین نے ایک
لمحہ کے تامل کے بغیر اپنا پیشہ ترک کر دیا۔ اور بلا اس خیال کے کہ اس
کا اور اس کے اہل و عیال کا کیا حشر ہو گا اپنی تمام جائداد اور املاک
ملک اور قوم کے لیے وقف کر دی۔ بینک کا روپیہ کب تک کام دیتا
اور پھر ایک ایسے شخص کو کہ جو بہت ہی کھلے دل سے خرچ کرنے کا عادی
ہو۔ چنانچہ یہی ہوا کہ چار پانچ سال کے بعد ریاض الدین کے پاس کچھ
باقی نہ رہا۔ اور وہ اس بات پر مجبور ہوا کہ کسی نہ کسی طرح محنت مشقت
کر کے کچھ کمائے۔ سرکاری ملازمت کے لائق عمر نہ تھی اور ہوتی بھی تو
وہ کر نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ گو ملک میں ترک تعاون کی تحریک سرد
پڑ گئی تھی۔ لیکن وہ اب بھی اسی قدر خلوص اور گرم جوشی سے اس پر
عامل تھا۔ تجارت کے لیے اول تو ایک خاص قسم کی طبیعت اور کافی
تجربہ کی ضرورت تھی۔ اور اگر نہ بھی ہوتی، تب بھی وہ مجبور تھا کیونکہ اس
کے پاس سرمایہ ہی نہ تھا۔ ڈھاکہ میں اُسے کوئی چھوٹا موٹا کام کرتے کسی
قدر حجاب سا معلوم ہوتا تھا اس لیے اس نے ترک وطن کی ٹھان

لی اور بدشواری تمام بمبئی میں ایک بڑی تجارتی کمپنی کے یہاں نوکری حاصل کر لی۔ اس کی تنخواہ صرف اس قدر تھی کہ مکان کا کرایہ ادا کرنے کے بعد تیس روپیہ ماہوار اُسے بچتے تھے۔ اور اس مختصر رقم سے وہ اپنے پورے گھر کا خرچ چلاتا تھا۔ جس میں ایک خود ایک اس کی بیوی اور دو بچے شامل تھے۔

صبح کے آٹھ بجے سے لے کر شام کے چھ بجے تک برابر ایک سا کرسی پر بیٹھ کر حساب کتاب کا دماغی کام کرنا کسی شخص کے لیے بھی آرام دہ اور فرحت بخش نہیں ہو سکتا نہ کہ ریاض الدین کے لیے کہ جس کی تمام عمر انتہائی عیش و عشرت میں بسر ہوئی تھی اور جسے اس سے پہلے کبھی ملازمت کی دشواریوں سے کوئی سابقہ پڑا ہی نہ تھا کام کی کثرت اور افکار کے ہجوم نے ریاض الدین کی صحت پر بہت ہی خراب اثر کیا۔ اور زندگی کی یکسانیت کے سبب سے اس کے اعصاب اس پانچ چھ سال کے عرصہ میں بالکل ہی ناکارہ اور ضعیف ہو گئے روزمرہ کی زندگی میں کسی قسم کا تغیر اور گردوپیش کے حالات میں کسی طرح کی تبدیلی کبھی ہوتی ہی نہ تھی۔ وہی روزانہ علی الصباح کا اُٹھنا وہ بدقلعی سا منہ دھونے کا لوٹا۔ وہی پھٹا ہوا سا دستر خوان جس پر فارسی کے دو ایک لایعنی سے شعر چھپے ہوئے تھے وہی گرم گرم روٹی اور رات کا سالن۔ وہی مراد آبادی گلاس جس کی قلعی جا بجا سے اتر چکی تھی۔ وہی بیوی اور بچوں کی غمگین صورتیں۔ وہ چار برس کا پرانا سیاہ کھدر

کا کوٹ، وہی زمانۂ خوش حالی کی یادگار آبنوس کی چھڑی، وہی دفتر کا راستہ، وہی منیجر صاحب سے تبادلہ سلام، وہی اُن کی کسی قدر حقارت آمیز اور دل میں چھید کر دینے والی نگاہیں۔ وہی دوکان کا کمرہ۔ وہی مرمت طلب کرسی۔ وہی موٹے موٹے اور بے انتہا وزنی رجسٹر۔ وہی صبح سے شام تک ایک ایک پہلو پر نشست وہی روپیہ آنے پائی کی جمع تفریق، ضرب تقسیم وہی تھکا ہوا جسم اور واپسی میں گھر کا راستہ، وہی خاموش اور ملول بیوی۔ وہی افلاس اور محتاجی کا شکار اور زندگی کی علامات سے محروم، بچوں کے مرجھائے ہوئے چہرے، وہی دال روٹی، وہی اس کی جھلنگا سی چارپائی اور وہی اس کی محروم خواب آنکھیں۔

یا اللہ۔ کیا اب کبھی ان حالات میں تبدیلی نہ ہوگی؟ کیا اب میں ہمیشہ ایسا ہی غریب اور محتاج رہونگا۔ ممکن ہے کہ میں نے کوئی قصور کیا ہو۔ اور یہ مجھے اس کی سزا مل رہی ہو۔ لیکن میرے بچوں نے کیا گناہ کیا ہے۔ وہ تو معصوم ہیں۔ ان پر یہ فقر و فاقہ کا عذاب کیوں نازل ہے۔......... ریحانہ! ہاں ہاں ماشاء اللہ وہ تو اب قریب قریب جوان ہو چکی۔ ایک بے نوا فقیر کی بچی کو کون پوچھے گا۔ یا اللہ میری یہ حالت کہ قبر میں پاؤں لٹک چکے۔ آمدنی بڑھنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ تیس روپیہ اور وہ بھی بمبئی جیسے شہر میں روکھی سوکھی پیٹ میں

پڑجاتی ہے، یہی غنیمت ہے۔ فیاض کس قدر دُبلا ہوگیا ہے۔ سب کافی غذا نہ ملنے کی خرابی ہے۔ کہیں خدا نخواستہ اُسے دِق نہ ہوجائے۔ .... کیا میں نے غلطی کی تھی؟ کیا مجھے ملک اور قوم کی آواز پر کان بہرے کر لینے چاہئیں تھے؟ کیا مجھے پہلے اپنا، اور اپنے بچوں کا خیال کرنا چاہئے تھا اور پھر ملک اور قوم کا؟ .... نہیں! ہرگز نہیں! میں نے کوئی غلطی نہیں کی ہے۔ میرے مذہب کا اور میرے ایمان کا یہی حکم تھا۔ میں نے جو کچھ کیا ہے اپنے ضمیر کی ہدایتوں کے مطابق کیا ہے۔ میں ہرگز ہرگز اپنے کیے پر نادم نہیں ہوں۔ قربانی تو اسی کو کہتے ہیں کہ جب ہم اپنے آرام اور اپنے عیش پر ملک اور قوم کے فائدے کو مقدم سمجھیں۔ اگر ہم کوئی تکلیف نہ اٹھائیں، تو پھر قربانی ہی کیا ہوئی؟ میرا دل مطمئن ہے کہ میں نے کوئی غلطی نہیں کی ہے۔ دنیا کا عیش، اور زندگی کا آرام اچھی چیزیں ہیں۔ لیکن اس قدر اچھی ہرگز نہیں ہیں کہ ان پر ایمان اور ضمیر کو قربان کر دیا جائے۔ .... مگر ریحانہ اور فیاض؟ کیا اپنے کلیجے کے ٹکڑوں کو ملک اور قوم پر قربان کیا جاسکتا ہے؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اگر میں نے وکالت اس طرح نہ چھوڑدی ہوتی تو آج میرے یہ دونوں بچے، اس قدر کمزور اور ایسے خستہ حال نہ ہوتے۔ کیا اس سے انکار ہوسکتا ہے کہ اپنے بچوں کی تباہی اور بربادی کا باعث میں خود ہوا ہوں؟ یا میرے

اللہ! کیا یہ صحیح ہے؟ آج مجھے کیا ہو گیا ہے۔ یہ کیسے خیالات رہ رہ کر میرے دماغ میں آرہے ہیں؟ (دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر) میں پاگل ہو جاؤں گا۔ یہ خیالات ہرگز میرے دماغ کو صحیح نہ رہنے دیں گے۔ اُف میرے اللہ! میں کیا کروں؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ خدایا تو ہی بہتر جانتا ہے کہ میں نے غلطی کی ہے یا صحیح اور مناسب کام کیا ہے .... بچوں کی قربانی! اوہ! میں بھی کس قدر غلطی میں مبتلا ہوں۔ میں نے بچوں کو قربان کب کیا ہے؟ خدا کے فضل سے دونوں زندہ اور صحیح وسالم موجود ہیں۔ انہیں تو اس بات کی خبر بھی نہیں ہے کہ میں کبھی خوش حال تھا۔ فیاض تو پیدا ہی میری غریبی کے زمانہ میں ہوا ہے۔ اور ریحانہ نے بھی جب سے ہوش سنبھالا انہی حالات میں رہی۔ یہ تو میرا خیال ہے کہ وہ بہتر حالات میں ہو سکتے تھے۔ وہ تو جس حال میں پیدا ہوئے اور ہوش سنبھالا اسی حال میں ہیں پھر انہیں میرے کسی فعل سے کیا تکلیف پہنچی اور ان کی حالت میں کیا فرق آیا؟ کچھ بھی نہیں۔ آخر لاکھوں کروڑوں غریبوں کے گھر بچے نہیں پیدا ہوتے۔ یہ دونوں بھی انہیں بدقسمتوں میں سے ہیں، اور ہاں خوب یاد آیا! قربانی کی رسم کی ابتدا بھی تو اسی طرح ہوئی تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے ہاتھ سے اپنے پیارے بیٹے کے گلے پر چھری پھیر دینے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ اور پھیر ہی دی تھی۔ اگر خدا کی طرف سے بر وقت ہدایت نہ ہوتی، اور حالات نہ بدل جاتے۔ میں نے تو صحیح معنوں میں

کسی بچہ کو قربان بھی نہیں کیا ہے۔ مجھے تو تھوڑی سی تکلیف ہی پہنچی ہے اور بس اسے تو قربانی کہنا ہی فضول ہے۔ نہیں میں نے غلطی نہیں کی ہے۔ مذہب، قوم اور وطن کی خاطر اگر میں اور میرا سارا گھر بھی کام آجائے تو رنج کی بجائے فخر و مسرت کا مقام ہے۔.......... مگر میں کیا کروں، میرا دماغ بالکل بیکار ہو چلا۔ اب تو مجھے ہر وقت یہ خوف رہتا ہے کہ کہیں کسی دن حساب کتاب میں کچھ غلطی نہ کر جاؤں.......
وہ منیجر اس کی نگاہیں دیکھی ہیں؟ خدا جانے کیوں مجھے اس قدر نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ کبھی کوئی غلطی پکڑلی تو کھا ہی جائے گا۔...
.... ریحانہ کی شادی۔ اللہ میرے حال پر رحم کرے۔ یہ دنیا رسم و رواج کی بندی ہے۔ لیاقت اور قابلیت کو کوئی نہیں دیکھتا ہر شخص دولت کا طالب ہے۔ کس قدر بیہودہ رسم ہے۔ میں اپنی بچی بھی اُن کے حوالے کروں۔ اور ساتھ ہی ایک معقول رقم بھی پیش کروں۔ گویا میری لڑکی کوئی مصیبت یا بلا ہے کہ بہت سارو پیہ مجھ سے لے کر ایک دوسرا شخص اس بات پر راضی ہوتا ہے کہ اس بلا کو اپنے گھر لے جائے۔
الٰہی تیری پناہ۔ ان مسلمانوں کو کیا ہو گیا ہے۔ جو رسم ہے اوندھی، جو رواج ہے مضر اور نقصاں رساں..........."

ریاض الدین اپنی خیالات میں مستغرق تھا کہ وہ دوکان آ گئی جہاں وہ ملازم تھا، اور منیجر کی دلخراش نگاہ نے اس سلسلہ خیال کو منقطع کر دیا حسب معمول منیجر کو سلام کر کے وہ اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ اور حساب

کے رجسٹر اُلٹنے شروع کر دیئے۔ لیکن آج کسی طرح کام میں اس
کا دل نہ لگتا تھا اور مطلق سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ ہاتھ کچھ
اس قدر بے قابو تھے کہ قلم ہاتھ سے گر پڑا۔ اور ایک رجسٹر کے سادے
صفحہ پر تمام دھبے پڑ گئے۔ دھبے دیکھتے ہی ریاض الدین کو منیجر کی قہر
آلود نگاہ یاد آ گئی۔ اس کا دل اندر سے کانپ گیا۔ اور بڑی محنت اور
کوشش سے اس نے اس داغ کو چھیل کر صاف کیا۔

کام کی طرف دماغ کسی طرح متوجہ ہوتا ہی نہ تھا۔ لکھی ہوئی رقمیں
آنکھوں کے سامنے موجود تھیں۔ لیکن سمجھ ہی میں نہ آتی تھیں۔
اور سمجھ میں بھی آ جاتیں تو انہیں جوڑنا ممکن نہ ہوتا تھا۔

تیئیس سات اکتیس۔ لاحول ولا قوۃ۔ یہ آج مجھے کیا ہو گیا ہے۔
آج ضرور کوئی نہ کوئی غلطی ہو جائے گی۔ دماغ کی اگر یہی حالت ہے، تو
آج خیر نہیں ہے۔ یہ تیس روپیہ مہینے کا سہارا بھی اب رہتا معلوم نہیں
ہوتا۔ .... کیا کروں کوئی اور کام بھی تو نہیں آتا۔ ہاتھ پاؤں
کا کام ہو تو دل چاہے نہ چاہے انسان کر تا رہ سکتا ہے۔ مگر یہ دماغی
کام کیسے کیا جائے۔ منیجر ہرگز نہیں چھوڑے گا۔ ایک غلطی بھی اس نے
پکڑ لی تو فوراً برخاست کر دے گا۔ اللہ نے بڑی خیر کر دی کہ لکھے ہوئے
صفحہ پر دھبہ نہ پڑا۔ نہیں تو نوکری اسی قصور پر ختم ہو چکی تھی۔ تیئیس
اور سات تیس اور چھ چھتیس۔ عید بھی تو قریب آ رہی ہے۔ بچوں
کے لئے کپڑے کہاں سے آئیں گے؟ ان غریبوں کے پاس تو شاید

ہی کوئی ثابت جوڑا ہو تو بہ توبہ۔ پھر وہی بیکار خیالات۔ خدا جانے کہاں تک جوڑ چکا تھا۔ سب بھول گیا۔ آج کام نہ ہو سکے گا۔"

بادلِ ناخواستہ ریاض الدین نے اپنا کام جس طرح بھی ہو سکا، پورا کیا۔ رقموں کے ایک ایک جوڑ کو چار چار چھ چھ مرتبہ دیکھا کہ مبادا غلطی ہو جائے۔ اور پھر کوئی تین بجے کے قریب رجسٹر اور کاغذات لیکر منیجر کے کمرہ میں دستخط کرانے کے لیے پہنچا۔ منیجر اگرچہ بے ایمان یا بدمعاش آدمی نہ تھا، لیکن اپنے ماتحتوں کے ساتھ بے انتہا سخت ضرور تھا۔ اور کبھی کسی کی غلطی پکڑ لیتا تھا تو اُسے سزا دیئے بغیر ہرگز نہ چھوڑتا تھا۔ رحم اور عفو کے جذبات سے اس کا دل بالکل ناآشنا تھا۔ اسی بنا پر عام طور پر سب ملازم اس سے بہت ہی ڈرتے اور کسی نہ کسی حد تک نفرت کرتے تھے۔ ریاض الدین کو اس کمپنی کی ملازمت کرتے اب کوئی سات برس ہو چکے تھے۔ لیکن آج تک کبھی منیجر کو اتنا موقع نہ ملا تھا کہ اُسے سزا دے سکے، یا اس سے کچھ کہہ سکے۔ ماتحتوں پر سختی کرنے کا شوق اُسے بار بار بیقرار کرتا تھا کہ کسی طرح ریاض الدین کی کوئی غلطی پکڑے۔ اور چونکہ اس کی کوئی غلطی کبھی نہ ملتی تھی، اس لیے منیجر کے دل میں ایک ضد سی پیدا ہو گئی تھی۔ اور ریاض الدین سے خوش ہونے کی بجائے جلنے لگا تھا۔

ریاض الدین کی جوڑی ہوئی رقموں کو اس نے ایک ایک کرکے

جانچا۔ اور یکایک اس کے ہونٹوں پر ایک ظالمانہ اور فاتحانہ تبسم نمودار ہوا۔ اس نے ریاض الدین کی غلطی پکڑ لی تھی۔ خشم آلود نگاہیں اوپر کو اٹھیں اور اس کے دیکھنے کے انداز ہی سے ریاض الدین نے محسوس کر لیا کہ آج خیر نہیں ہے۔ اس کا دل بہت ہی تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا آگیا۔ مینجر نے جب رجسٹر کی طرف اشارہ کر کے اس سے پوچھا کہ یہ آپ نے کیا لکھدیا ہے۔ تو اسے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اور خود اپنا لکھا ہوا اس سے پڑھا نہ جاتا تھا۔ بدقت اس نے تمام عینک کو دو مرتبہ ناک پر سنبھال کر رکھنے کے بعد اُسے کچھ نظر آیا۔ اور اس نے دیکھا کہ اس نے ایک بڑی سخت غلطی کر دی ہے۔

"آپ نے تو کمپنی کو تباہ ہی کر دیا تھا۔ اگر میں اس غلطی کو نہ دیکھ لیتا، تو ہزاروں روپیہ کا نقصان ہو جاتا۔ اور کسی کو خبر تک نہ ہوتی۔ جو شخص ایک مرتبہ ایسی غلطی کر سکتا ہے وہ دس مرتبہ بھی کر سکتا ہے۔ کیا معلوم آپ نے کمپنی کو کس قدر نقصان پہنچا دیا ہو۔"

"یقین کیجئے۔ میں نے کبھی پہلے کوئی غلطی نہیں کی ہے اور اپنی اس غلطی کے لئے میں بہت ہی نادم اور شرمندہ ہوں۔ سات سال کی ملازمت میں میری یہ پہلی غلطی ہے اور مجھے اُمید ہے کہ آپ معاف کر دینگے۔"

مینجر۔ (ایک سنگدلانہ قہقہہ لگا کر) یہ لفظ تو میرے لغت میں ہے ہی نہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ اب آپ کے ہاتھوں میں اس قدر ذمہ داری

کا کام نہیں دیا جا سکتا۔"

ریاض "۔منیجر صاحب! آپ میرے حال پر رحم کیجیے، یہ پہلی غلطی ہے اگر آیندہ مجھ سے کوئی غلطی ہو، تو آپ ضرور مجھے برخاست کر دیجیے گا"

ریاض الدین کی عاجزانہ درخواست پر منیجر کے مغرور دل نے اطمینان محسوس کیا۔ اور جس طرح بلی اپنے شکار سے تھوڑی دیر کھیلا کرتی ہے۔ وہ بھی طعن آمیز گفتگو کے ذریعہ سے اپنے شکار سے کھیلتا رہا۔ اور آخر میں یہ فیصلہ کیا کہ " اچھا میں آپ کو بالفعل برخاست نہیں کرتا اور صرف دس روپیہ جرمانہ کر کے چھوڑے دیتا ہوں۔ آیندہ آپ کے ساتھ اتنی رعایت نہ کی جائے گی۔"

خستہ و درماندہ اور افسردہ و ملول ریاض الدین شام کو جب گھر پہنچا تو اس کی عجیب حالت تھی۔ قدم رکھتا کہیں تھا، اور پڑتا کہیں تھا سات سال کی پڑی ہوئی عادت کے مطابق، اس نے کوٹ کو اُتار کر کھونٹی پر ٹانگ دیا۔ لیکن اس کے بعد اس میں اتنی سکت نہ تھی کہ کھڑا رہتا۔ بالکل مضمحل اور بے حال ہو کر وہ اوندھا سیدھا اپنی چارپائی پر گر پڑا اور چھت کی طرف ٹکٹکی باندھ کر اپنے خیالات میں مصروف ہو گیا

اس کی بیوی صغرےٰ اسے خلاف معمول اسے اس قدر رنجیدہ اور پریشان دیکھ کر گھبرا گئی اور چولھے پر جو دیگچی چڑھی تھی اسے اُتار کر دوڑتی ہوئی اس کے پاس آئی۔ ریحانہ کچھ سینے پرونے میں مشغول تھی۔ اس

نے بھی یہ حالت دیکھی تو سینا پرونا چھوڑ چھاڑ باپ کے سرہانے آکر بیٹھ گئی۔

صغریٰ:۔"آج تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ اس قدر سست کیوں ہو؟ کیا بات ہے؟"۔

ریاض:۔"کچھ نہیں کام کرتے کرتے تھک سا گیا تھا (ریحانہ سے) بیٹی ذرا حقہ بھر لو"

صغریٰ:۔ نہیں۔ میں تو نہیں مانوں گی۔ آج کچھ خاص بات ہے ضرور۔ کام تو تم روز مرہ اتنا ہی کرتے تھے، تمہارے چہرے سے معلوم ہو رہا ہے کہ تمہیں کچھ رنج پہنچا ہے۔ کیا مجھے بھی نہیں بتاؤ گے (ریاض کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور آہستہ آہستہ دبانے لگی۔)

ریاض۔ (زبردستی مسکرا کر) تم خواہ مخواہ کیوں پریشان ہوئی جاتی ہو، کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔ آج میرے خیالات کچھ اس قدر پریشان تھے کہ مجھ سے کام نہ ہو سکا اور ایک سخت غلطی ہو گئی۔ وہ مینجر تو مدتوں سے تاک میں تھا ہی آج اُسے موقعہ مل گیا۔ غلطی دیکھتے ہی اس نے کہہ دیا کہ تم نوکری کے لائق نہیں ہو۔ بڑی منت (خوشامد کی) تو دس روپیہ جرمانہ کر کے اس نے چھوڑا۔ اب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ صرف بیس روپیوں میں گھر کا کام کیسے چل سکیگا۔ اور پھر اوپر سے عید بھی آ گئی۔ ان بچوں کے پاس کچھ ثابت چیتھڑا تک نہیں ہے۔ تہوار کے دن نئے نہ ہوتے بلا سے۔ پرانے ہی کپڑے پہن لیتے مگر ثابت تو ہوتے۔ انہی خیالات نے

اس قدر پریشان کر دیا۔ ادھر منیجر کی گفتگو سے ایسا صدمہ پہنچا تھا کہ اس وقت سے دل بیٹھا جا رہا ہے۔ اور میں گھر بڑی مشکل سے پہنچا ہوں۔

صغریٰ:۔ تم گھر کے خرچ کی فکر نہ کرو۔ میں جیسے بھی ہو سکیگا میں ہی میں پورا کر لوں گی۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔ جس کے لئے تم اس قدر رنج کرتے ہو۔ ایک ذرا سا دودھ پی لو۔ اس سے دل کسی قدر ٹھیر جائیگا"

ریاض:۔ نہیں دودھ تو میں اس وقت نہیں پیوں گا۔ میں دس روپیوں کے نقصان کی وجہ سے پریشان نہیں ہوں۔ بلکہ اب تو فکر یہ ہے کہ مجھ سے کام ہی نہیں ہوتا۔ میرے دماغ کی کچھ ایسی حالت ہو گئی ہے کہ کسی طرح کام کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتا۔ ایسی حالت میں جب کہ میں بے دلی اور بے توجہی سے زبردستی کام کروں گا تو ناممکن ہے کہ اس میں غلطیاں نہ ہوں۔ اور اب اگر کوئی غلطی ہو گئی تو اسی دن یہ نوکری بھی ہاتھ سے جاتی رہے گی۔

ریحانہ (جو اب حقہ بھر کرلے آئی تھی)، تو ابا جان آپ اس نوکری کو چھوڑ ہی دیجیے نا"

ریاض۔ (زبردستی ہنس کر) اور پھر گھر میں بیٹھکر تمہارے ساتھ گڑیاں کھیلا کروں۔ کیوں ہے نا یہی بات؟"

ریحانہ۔ (شرما کر) "میں تو یہ کہہ رہی تھی آپ کوئی اور کام کیوں نہیں کرتے۔ جس میں اتنی محنت بھی نہ ہو، اور اس نگوڑے منیجر سے بھی چھٹکارا مل جائے"

ریاض۔ "بیٹی میں کیا کروں۔ مجھے تو کوئی اور کام آتا ہی نہیں۔"
ریحانہ "آپ تجارت کیوں نہیں کرتے۔ مزے سے اپنی دوکان پر بیٹھے سودا بیچے جایئے۔ نہ کسی کے نوکر نہ کسی کے چاکر۔"
ریاض۔ "تجارت واقعی ایسی ہی اچھی چیز ہے۔ مگر بیٹی مشکل یہ ہے کہ تجارت خالی ہاتھ پیروں سے نہیں ہو سکتی۔ روپیہ روپیہ کو کھینچا کرتا ہے۔ تجارت میں جب پہلے اپنا روپیہ لگایا جاتا ہے۔ تب اس سے روپیہ کمایا جاتا ہے۔"
صغریٰ۔ "صغریٰ کیا یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ تم کہیں دوسری جگہ نوکری ہی کر لو۔ میں تو یہ کہتی ہوں کہ اس سے پانچ روپیہ کم کی ہو تب بھی تم یہاں سے چھوڑ دو۔ یہاں تو ہر وقت اس دشمن سے سابقہ ہے۔ اور خدا جانے کس وقت اسے ستانے کا موقع مل جائے۔ تو آپ تو یوں ہی گھل گھل کر خالی ہڈیاں رہ گئے ہیں۔ اب اس مینجر کا ڈر اور بھی ہلاک کر دیگا۔ آمدنی میں تھوڑی سی کمی ہو جائے گی۔ بلا سے ہو جائے دوسری جگہ کی نوکری میں یہ ہر وقت کا رنج اور ڈر تو نہ ہوگا۔"
ریاض۔ "عورتیں سب یہی سمجھا کرتی ہیں اور تم بھی یہی سمجھ رہی ہو کہ نوکریاں میرے لیے تیار رکھی ہیں۔ ادھر میں نے یہاں سے چھوڑی اور اُدھر دوسری مل گئی۔ بیگم نوکری بڑی مشکل سے ملتی ہے اسی لیے تو لگا روزگار چھوڑنے کی ہمت نہیں پڑتی اور پھر تم یہ بھی تو دیکھو کہ اب میں بالکل بڈھا ہو گیا ہوں۔ اتنی عمر والوں کو کون پوچھتا ہے؟"

ریحانہ۔ "تو اباجان تجارت کے لیئے ایسا کتنا روپیہ چاہیے؟"
ریاض نے مسکرا کر "تمہارے پاس کتنا جمع ہے؟"
ریحانہ۔ "میرے پاس کہاں سے آیا۔ میں تو اس لیئے پوچھ رہی تھی کہ کیا آپ تھوڑا بہت روپیہ کہیں سے قرض لے کر دوکان نہیں کھول سکتے؟"

ریاض۔ بیٹی مجھے یہاں کون جانتا ہے جو ہزار پانسو روپیہ قرض دیدے گا۔ تم اتنی فکر نہ کرو۔ آج اس جرمانے کا مجھ پر بہت اثر ہوا تھا۔ اس لیئے طبیعت خراب ہو گئی۔ کل خدا نے چاہا تو میں بالکل اچھا ہو جاؤنگا۔

ریاض الدین کی توقعات کے خلاف اس کی طبیعت روز بروز کچھ اور گرتی ہی چلی گئی۔ حد سے زیادہ اختلاج قلب کے دورے پڑنے لگے جن کی وجہ سے وہ حد سے زیادہ کمزور اور ناتواں ہوتا چلا گیا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اب اسے گھر سے دفتر تک جانا بھی دشوار ہو گیا۔

علاج معالجہ کے لیئے ریاض کے پاس رکھا ہی کیا تھا جو اس طرف توجہ کی جاتی۔ وہ دو ایک مرتبہ خیراتی شفاخانہ گیا بھی۔ لیکن کبھی تو ایسا ہوا کہ ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہی نہ ہونے پائی اور اس کا دفتر کا وقت ہو گیا اور کبھی اگر مِل بھی گئے تو اُنہوں نے بے توجہی اور بے پروائی کے ساتھ اُسے دیکھ کر کچھ دوا دے دی۔ جس کا پینا نہ پینا برابر تھا۔

ڈاکٹر لطیفی سے اس کے کچھ تعلقات تھے، اور اس دوران میں وہ اکثر انہی کے پاس جاتا۔ اور ان سے دوائیں لاتا بھی رہا۔ لیکن وہ چونکہ اس سے دوا کی قیمت نہ لیتے تھے، اس لیے اسے انتہائی ضرورت اور مجبوری کے بغیر، ان کے پاس جاتے شرم آتی تھی۔ ڈاکٹر لطیفی خود ہی اکثر شام کو اس کے گھر آجایا کرتے تھے اور ان سے اس قدر بے تکلفی بڑھ گئی تھی کہ صغریٰ اور ریحانہ پردہ بھی نہ کرتی تھیں۔ ایک روز لطیفی نے شام کے وقت ریاض الدین کی نبض دیکھ کر بہت ہی سنجیدگی سے کہا:۔

"ریاض صاحب! آپ اپنی تندرستی کی ذرا پرواہ نہیں کرتے میں آپ سے پہلے بھی کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں، اور آج پھر کہتا ہوں کہ آپ کی غفلتوں کی وجہ سے آپ کا مرض بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اور اگر اب بھی آپ نے غفلت کی، تو شاید حالت بہت زیادہ خراب ہو جائے گی۔"

ریاض۔ (ہنس کر) "ڈاکٹروں کو ہمیشہ یہی وہم رہا کرتا ہے۔ میں تو خدا کا شکر ہے بالکل اچھا خاصا ہوں۔ کسی قدر کمزوری ہے اس کے لیے آپ نے دوا دے رکھی ہے۔ چند روز میں جاتی رہے گی۔"

لطیفی۔ "دوا کچھ نہیں کر سکتی۔ جب تک کہ آپ کے دماغ کو آرام نہ ملے۔ آپ چاہے دوا بالکل نہ پیجئے۔ لیکن کام بالکل نہ کیجیے۔"

ریاض :۔ (ہنس کر) "آپ کو معلوم ہے کہ میں ایک سرمایہ دار کا ملازم ہوں، اور سرمایہ دار صرف اسی حالت میں کسی مزدور کو تنخواہ دیا کرتے ہیں کہ جب اس نے تنخواہ سے زیادہ کام کر دیا ہو۔ مجھے چھٹی اگر مل سکتی ہے، تو بغیر تنخواہ کے مل سکتی ہے۔ ایسی صورت میں آپ ہی بتایئے کہ میں کس طرح آرام کر سکتا ہوں"۔

اس کا جواب لطیفی کے پاس کچھ نہ تھا۔ خاموش ہو کر اس نے ادھر اُدھر دیکھا، اور صرف اتنا کہا کہ "خواہ کچھ بھی ہو تندرستی کا خیال ہر چیز پر مقدم ہے اور مجھے آپ کی موجودہ حالت میں آپ کے لیے بہت سے خطرات نظر آ رہے ہیں"۔

ریاض ۔ (ہنس کر) "یعنی یہ کہ میں مر جاؤں گا (قہقہہ لگا کر) ڈاکٹر صاحب! کیا موت سے آپ ایسے شخص کو بھی ڈرا سکتے ہیں، جو اسے اپنے درد کا علاج سمجھتا ہو کیا آپ کے خیال میں اس دنیا کے اندر میرے لیے کوئی ایسی دلچسپی موجود ہے کہ جس کے لیے میں زندہ رہنے کی تمنا کروں؟"۔

لطیفی (صغریٰ اور ریحانہ کی طرف اشارہ کر کے) "کیا یہ دلچسپی کافی نہیں ہے!"

ریاض ۔ "انہیں کو زندہ رکھنے کے لیے تو میں کام کیا کرتا ہوں۔ ورنہ اکیلے اپنے لیے مجھے اتنی تکلیف اُٹھانے کی کیا ضرورت تھی۔ میں آپ کو یہی تو بتانا چاہتا تھا کہ اگر میں کام نہ کروں تو اس کا اثر مجھ پر نہیں بلکہ ان سب پر پڑیگا۔ اور آپ خود ہی خیال فرمایئے کہ مجھے کس طرح گوارا ہو سکتا ہے کہ اپنے آپ کو آرام دینے کی خاطر میں اپنی بیوی اور اپنے

بچوں کو مصیبت میں مبتلا کر دوں۔ یقین کیجئے کہ ایسی ایسی ہزار زندگیاں بھی ان پر قربان ہیں۔

سب خاموش ہو گئے، لطیفی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور کچھ دیر کے بعد وہ یہ کہتا ہوا چلا گیا۔ کہ "آپ زندہ نہ رہے تو اس وقت تو یہ اور بھی زیادہ مصیبت میں مبتلا ہو جائیں گے"

دوسرے دن صبح کو ریاض الدین کی طبیعت نسبتاً کچھ بہتر تھی اور اگرچہ صغریٰ اور ریحانہ نے یہ کہہ کر کہ ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے اور ہم خود محنت مزدوری کر کے گھر کا خرچ چلا لیں گے اسے دفتر جانے سے روکنے کی کوشش کی، لیکن وہ کسی طرح راضی نہ ہوا۔ اور یہ کہہ کر آنکھوں میں آنسو بھرے گھر سے نکل گیا کہ "میری زندگی میں میری بیوی اور بچے میرے لئے محنت نہیں کر سکتے" اس کے چلے جانے کے بعد ریحانہ نے ماں سے کہا

"امی جان آپ آخر وہ روپیہ ابا جان کو دے کیوں نہیں دیتیں ان کا چاہے کچھ حال بھی ہو جائے، وہ محنت کرنے سے باز نہ آئیں گے۔ اور کل ڈاکٹر لطیفی نے جس طرح باتیں کی تھیں، اُن سے تو مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے کہ شاید دشمنوں کی طبیعت کچھ زیادہ خراب ہے"

صغریٰ۔ (چہرہ پر ایک خاص انداز پیدا کر کے) "بیٹی اب میں تمہیں کیا بتاؤں کہ وہ روپیہ میں نے کس کام کے لئے رکھے تھے۔ مجھے تو

جتنی فکر ان کی ہے، اتنی ہی اور دل کی ہے۔ مگر اب مجبوری کو یہی کرنا پڑے گا کہ وہ سب روپے انہیں دے کر ان سے نوکری چھڑائی جائے۔"

ریحانہ رجحان کے اس اشارہ سے کچھ شرما سی گئی تھی۔ "اب سب کتنے روپیہ ہو گئے؟ میرے خیال میں تو اب پانچسو سے اوپر ہو گئے ہوں گے۔ کیونکہ سات برس سے آپ چار روپیہ مہینہ دھلائی کے نام کا بچا کر رکھ ہی رہی ہیں۔ اور صرف اسی کے تین سو سے اوپر ہو جاتے ہیں۔"

صغریٰ۔ "پانچسو ابھی پورے تو نہیں ہوئے ہیں۔ مگر ہاں کچھ تھوڑی سی کمی ہے۔"

ریحانہ۔ "بس تو آج ہی شام کو یہ روپے انہیں دیدیجئے۔ ابا جان کو کس قدر خوشی ہو گی۔ برسوں سے کبھی انہیں ہنستے یا خوش ہوتے نہیں دیکھا ہے۔ اللہ کرے کہ پانسو روپیہ سے ان کی دوکان خوب چل جائے۔"

صغریٰ۔ "ہاں خدا میں سب قدرت ہے۔"

ریحانہ۔ "ڈاکٹر لطیفی کا دواخانہ تو خوب چل رہا ہے۔ اگر وہ اسی میں پانچسو روپیہ ابا جان کے بھی شامل کر لیں تو اچھا خاصا نفع ہو سکتا ہے۔"

صغریٰ۔ "ہاں ہے تو ٹھیک بات۔ مگر معلوم نہیں تمہارے اباجان ان سے کہنا پسند کریں گے یا نہیں۔"

ریحانہ۔ "آج شام کو ڈاکٹر صاحب آئے تو میں ان سے کہدونگی پھر

اباجان کو انکار کرنے کا موقع نہیں رہے گا۔

صغریٰ۔ "تمہارے اباجان کہیں بُرا نہ مان جائیں"۔

ریحانہ۔ "بُرا کیوں ماننے لگے تھے۔ ڈاکٹر لطیفی کو اباجان سے بڑی محبّت ہے۔ کل تو بیچارے رونے لگے تھے۔ اور پھر اس میں ڈاکٹر صاحب ہمیں مفت میں کوئی چیز تھوڑی ہی دیں گے۔ اور میرے کہنے کا اباجان ہرگز بُرا نہیں مانیں گے"

شام کو جب ریاض الدین واپس آیا تو اس کی حالت بہت ہی خراب تھی۔ اختلاج کا شدید ترین دورہ پڑا تھا۔ اور سات سال میں آج پہلی مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ وہ گھر کو پیدل واپس نہ آسکا۔ ڈاکٹر لطیفی کے مطب میں وہ ہوتا ہوا آیا تھا، اور وہ اس کے ساتھ ساتھ آئے تھے۔

آتے ہی اُسے بستر پر لٹا دیا گیا۔ اور ڈاکٹر لطیفی نے پچکاری کے ذریعہ سے دل کی تقویت کے لئے دوا پہنچائی، تو تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد کسی قدر سکون ہوا،

صغریٰ نے یہ دیکھ کر کہ اب دورہ ختم گیا ہے، اور حالت بہتر ہے اُسے خوش خبری سنانی چاہی

صغریٰ۔ اب چاہے کچھ ہو جائے، میں ہرگز ہرگز تمہیں کل سے کام کرنے کو نہیں جانے دوں گی"

ریاض۔ (زبردستی مسکرا کر) کیا گھر میں کوئی خزانہ نکل آیا ہے؟"

صغریٰ۔ "خزانہ نکل آیا ہے جبھی تو کہہ رہی ہوں"

ریاض ۔ (مسکرا کر) ۔ جب خزانہ نکل آئے گا تو میں دفتر جانا چھوڑ دونگا۔
صغریٰ ۔ "خزانہ تو نکل آیا ۔ میں لا کے تمہیں دکھاؤں ؟"
یہ کہہ کر وہ تیزی سے اٹھی ۔ اور کمرے میں جا کر ایک بکس میں سے نوٹوں کا بنڈل اٹھا لائی ۔ "لو یہ پانسو روپیہ ملے ہیں ۔ اب ان سے تم کوئی دوکان کر لو "

ریاض الدین نے آنکھیں پھاڑ کر نوٹوں کے بنڈل کی طرف دیکھا گھبرا کر جلدی سے اٹھا اور ان کے لئے ہاتھ بڑھائے
" کتنے روپئے ؟ ایں ! کتنے پانچ سو ...."
اس کی آنکھیں اوپر کو چڑھ گئیں ۔ زبان سے فقرہ پورا نہ ہو سکا اور بیہوش ہو کر بستر پر گر پڑا ۔
لطیفی نے گھبرا کر نبض پر ہاتھ رکھا ۔ نبضیں ساقط تھیں ۔ دل کی حرکت بند ہو چکی تھی ، اور سانس لینے کے لئے منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا ریاض الدین کا کمزور دل اس ناگہانی خوشی کے دھکے کو نہ برداشت کر سکا ۔ اور اب جبکہ مصیبتوں سے نجات ملنے کا موقع آیا تو اس نے دنیا کے سبھی جھگڑوں سے نجات حاصل کر لی ۔

حفاظت کا فرشتہ

حسین اور پر جمال منیرہ نے بالوں میں کنگھی کی، اور پھر بہت دیر تک کھڑی ہوئی آئینہ میں اپنے حسن و جمال اور اپنے چہرہ کے خد و خال کو دیکھتی رہی اس کا رنگ خوب کھلتا ہوا گندمی تھا۔ اور تندرستی اور شباب نے اس کے رخساروں کو ایک سیب سے بھی زیادہ خوبصورت اور خوشنما بنا دیا تھا۔ اس کے ہونٹھ پتلے، نازک اور بیحد سُرخ تھے۔ اور اس کی آنکھیں کچھ ایسی دلکش تھیں کہ وہ خود بھی جب کبھی آئینہ دیکھتی تھی تو بس اپنی آنکھوں ہی کو دیکھتی رہجاتی تھی۔ منیرہ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ حسن صورت کے لحاظ سے وہ ہزاروں عورتوں میں انتخاب کئے جانے کے لائق ہے اور اس احساس نے اسے ایک حد تک مغرور بنا دیا تھا۔ آئینہ دیکھتے دیکھتے۔ خدا جانے اُسے کیا خیال آیا کہ اس نے ایک انگڑائی لے کر کہا

میں بھی کس قدر بد نصیب ہوں! خدا نے شکل و صورت اچھی دی تو قسمت ایسی پھوٹی ہوئی دیدی۔ بھلا میرا یہ زمانہ اُن سے الگ رہنے کا تھا؟ آج دو سال ہو چکے کہ ان کی صورت کو ترس رہی ہوں، میں جانتی ہوں کہ وہ روپیہ کمانے گئے ہیں۔ لیکن ایسی دولت بھی کس کام کی جس سے زندگی

کا کوئی لطف ہی باقی نہ رہے۔ اب تو چاہے جو کچھ بھی ہو انہیں آ جانا چاہیئے۔ میں آج ہی انہیں خط لکھتی ہوں"۔

دلربا اور دلفریب چہرہ پر پھر ایک نگاہ ڈال کر اور بالوں کی ایک لٹ کو پھر اس کی جگہ جما کر وہ آئینہ کے پاس سے ہٹی۔ اور لکھنے کی میز پر جا بیٹھی۔ خط لکھنے کا کاغذ نکالا اور یہ دیکھ کر کہ ننھا آرام سے اپنے کھٹولے پر سو رہا ہے، اطمینان کے ساتھ خط لکھنے بیٹھ گئی۔ خط کا ایک کاغذ ختم ہوا۔ دو ختم ہوئے، تین ختم ہوئے اور چوتھا قریب ختم تھا کہ خدا خدا کر کے اس کا خط ختم ہوا۔ جلدی جلدی پھر ایک مرتبہ سارا خط پڑھا اور موڑ کر لفافہ میں بند کر دیا۔ اور یہ کہتی ہوئی ننھے کے کھٹولے کی طرف چلی کہ "دیکھوں اب وہ کیسے نہیں آتے"۔

بچہ جاگ چکا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر ماں کو دیکھا، اور مسکرا کر ہاتھ پھیلا دیئے۔ "اس کی صورت بالکل انہی کی سی ہے" کہہ کر منیرہ نے بچے کو گود میں لیا۔ خوب بھینچ بھینچ کر پیار کیا۔ اور پھر اس کا منہ دھلانے اور اسے دودھ پلانے میں مصروف ہو گئی۔

خاوند کو خط بھیجے آج پندرہ روز ہو چکے تھے۔ اور اب تک نہ وہ خود آیا، نہ خط کا جواب، برما سے زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ میں جواب آ جانا چاہیئے تھا۔ لیکن رشید خط و کتابت کے معاملہ میں کچھ اس قدر سست واقع ہوا تھا کہ اکثر منیرہ دو دو اور تین تین خط بغیر جواب

کے پڑے رہتے تھے اور اسے پرواہ بھی نہ ہوتی تھی۔ روپیہ کمانے اور روپیہ جمع کرنے کے سوا دنیا میں رشید کو کسی اور چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ اور منیرہ کا حسن گلوسوز بھی اس کے دل میں اپنے لئے کوئی جگہ نہ نکال سکا تھا۔ اس نے منیرہ کا خط اپنی معمولی بے پروائی کے ساتھ پڑھا اور میز کی اسی دراز میں ڈالدیا کہ جس میں اس سے پہلے اور بہت سے خطوط ڈالے جا چکے تھے۔

"اس بیوقوف عورت نے ناک میں دم کر دیا ہے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اپنا سب کام چھوڑ کر چند روز کے لئے گھر چلا جاؤں؟ ابھی مجھے گھر سے آئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں کہ میرے بلانے کی ایسی جلدی پڑ گئی۔ منیرہ کو میں یہاں بلا لیتا۔ مگر میں جانتا ہوں کہ یہاں آکر وہ میرے لئے مصیبت ہو جائے گی۔ سارا دن آٹے دال کی فکروں میں گذر جایا کریگا۔ اور میں اپنا کام کچھ بھی نہ کر سکونگا۔ بس یہی ٹھیک ہے کہ وہ آرام سے گھر پر بیٹھی رہے اور میں دو چار پیسے کما لوں"

اپنے دل سے یہ باتیں کر کے رشید اپنے کاروبار میں مصروف ہو گیا اور پھر اسے خیال بھی نہ آیا کہ منیرہ نے کیا لکھا تھا۔ اور نہ اس نے کبھی اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ جواب میں دو سطریں لکھ کر بھیجدے۔

منیرہ اس قدر آسانی سے مان جانے والی نہ تھی۔ اس نے اوپر تلے چار خط بھیجے۔ اور اپنا تمام زور تحریر صرف کر دیا۔ آخری خط کے متعلق اسے کامل امید تھی کہ اس کے جواب میں ضرور رشید خود بھاگا ہوا آئے گا لیکن

جب کافی سے زیادہ مدت گذر جانے پر بھی نہ رشید آیا' اور نہ خط کا جواب، تو اس کا دل ٹوٹ گیا۔ اور اس خیال نے اس کے غرور کو سخت صدمہ پہنچایا کہ رشید کو میری کچھ پرواہ نہیں ہے، اور وہ آئینہ کے پاس گئی اور خوب غور سے اس میں اپنی صورت دیکھنے کے بعد جب یہ اطمینان ہو گیا کہ اس کے زاہد فریب حسن میں کوئی فرق نہیں آیا ہے، تو اس کے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی۔ بچہ کو کلیجہ سے لگا کر وہ خوب روئی۔ اور اس کے بعد عہد کر لیا کہ اب خواہ کچھ بھی ہو جائے، ہرگز رشید کو خط نہ لکھے گی۔

آخر وہ بھی تو عورتیں ہی ہوتی ہیں، جو اپنی تمام عمر رنڈاپے میں بسر کر دیتی ہیں۔ میں بھی یہی سمجھ لوں گی کہ خدا نہ کرے میں بیوہ ہو گئی ہوں۔ وہ روپیہ کے پیچھے دیوانے ہیں تو رہیں۔ ان کا روپیہ انہیں مبارک، اب تو اگر ان کا خط بھی آیا تو میں جواب نہ دوں گی۔ جب انہیں میرا اتنا سا خیال بھی نہیں ہے، اور وہ میرے ایسے ایسے خطوط کا جواب تک نہیں دیتے تو مجھی کو کیا غرض پڑی ہے کہ خواہ مخواہ خط بھیجکر ان کا وقت ضائع کروں اور ہاں وہ انہیں پڑھتے ہی کیوں ہوں گے، جو وقت ضائع ہو۔ لفافہ دیکھ کر یوں ہی بے پڑھے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتے ہوں گے۔ غضب خدا کا اس ظلم کی کوئی انتہا ہے کہ انہوں نے دو برس سے لوٹ کر خبر بھی نہ لی کہ ہم زندہ ہوں یا مر گئے۔ مجھ سے محبت نہ تھی تو خیر نہ ہو۔ لیکن انہیں کبھی اپنے اس بچے کے دیکھنے کی بھی تمنا نہ ہوئی۔ روپیہ کیا انہیں قیامت میں بخشوا دے گا؟ اور پھر میں یہ تو نہیں کہتی کہ تم روپیہ نہ کماؤ یا جمع کرکے

نہ رکھو۔ میری تمنا تو صرف اس قدر تھی کہ یا تو وہ مجھے بھی وہیں اپنے
پاس بلا لیتے۔ یا اگر یہ مناسب نہ تھا تو سال دو سال میں تو گھر کا ایک
پھیرا کر جاتے۔ مگر اونہہ۔ اب مجھے کیا مطلب، آئیں تو اور نہ آئیں تو
میری طرف سے اب وہ دس برس بھی نہ آئیں۔ تو مجھے کچھ پرواہ نہیں
ہے۔ آتے تو انہیں کا اپنا دل خوش ہوتا، اپنے بچے کو دیکھ لیتے اپنے
وطن میں چند روز رہ لیتے۔ یا دوستوں سے ملاقات کر لیتے۔ اتنے دنوں
تک برابر محنت کرتے کرتے تھک گئے ہوں گے مہینے دو مہینے آرام کر
کو مل جاتا۔ وہاں خدا جانے کھانے پینے کو کیا ملتا ہوگا۔ اور وقت پر
ڈھنگ سے ملتا بھی ہو یا نہ ملتا ہو۔ ضرور کمزور ہو گئے ہوں گے۔ یہاں گھر
چند روز اچھی طرح کھاتے پیتے تو پھر تندرست اور تازہ دم ہو کر اپنے
کام پر جا سکتے تھے۔.........

"حسینی! اگر اس دفعہ تم نے ہمارا یہ کام کر دیا تو ہم جانیں گے ہاں تم
بہت ہوشیار ہو۔"

حسینی۔ "حضور میں اپنی طرف سے تو کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھتی، مگر
ہاں میں یہ بھی جانتی ہوں کہ کام بننا آسان نہیں ہے۔ خدا نے پانچوں
انگلیاں ایک سی نہیں بنائی ہیں۔ اس دفعہ جہاں آپ کی نگاہ لڑی ہے
وہ ان عورتوں میں نہیں ہے۔ جو آسانی سے لالچ میں آ جاتی ہیں، اور
اپنی عزت دآبرو سب کھو بیٹھی ہیں۔ پھر بھی میں آپ سے وعدہ کرتی

ہوں کہ میں آپ کے لیئے زمین آسمان ایک کر دوں گی اور جس طرح بھی ہو سکیگا اُسے جال میں پھانس کر ہی چھوڑ دں گی۔ روپیہ کو اللہ نے بڑی قدرت دی ہے۔ اور اس کے خرچ کرنے میں آپ کو دریغ نہیں ہے"۔

"روپیہ کی طرف سے تم بالکل فکر نہ کرو۔ دس روپیہ سے لیکر دس ہزار تک جتنے بھی خرچ ہو جائیں مجھے منظور ہیں۔ اور تمہارا اپنا انعام تو اس مرتبہ اتنا ہوگا کہ تم خوش ہو جاؤ گی۔ اصل یہ ہے حسینی کہ اب تک میں جانتا ہی نہ تھا کہ محبّت کیا چیز ہوتی ہے۔ اور ہمیشہ یہی ہوا کرتا تھا کہ کسی حسین عورت کو دیکھا دل میں ایک گدگدی سی پیدا ہوئی، تم سے کہدیا، تم دو چار روز میں اسے لے آئیں۔ اور بس دو چار مرتبہ کی ملاقات میں وہ شوق و خواہش، وہ محبت سب ختم۔ ایسا بھی اکثر ہوتا تھا کہ ایک عورت کے متعلق تم سے فرمایش کر رکھی ہے، اور اسی عرصہ میں کسی اور کو دیکھ لیا، تو اسے بھول کر اس دوسری کے پیچھے ہو لیا۔ اور اس پہلی کا خیال تک نہ رہا۔ مگر اس مرتبہ تو عجیب حالت ہے۔ اب میرے دل میں گدگدی نہیں ہوتی، بلکہ رونا سا آتا ہے اور میں تم سے سچ کہدوں کہ اس سے ملنے کو نہیں بلکہ اس کے لئے مرجانے کو جی چاہتا ہے۔ تمہیں خود بھی معلوم ہے کہ پہلے اگر میں کسی عورت کے لئے تم سے کہتا تھا اور تم اُسے نہ لاسکتی تھیں، تو مجھے زیادہ سے زیادہ اتنا رنج ہوتا تھا کہ جتنا تاش کی ایک بازی ہار جانے سے ہوتا ہے۔ لیکن اب ایسا نہیں ہے،

اب اگرچہ مجھے ناکامی ہوئی تو میں ہرگز زندہ نہ رہ سکوں گا۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ شراب کا ایک گلاس پینے کے بعد، میں سب کچھ بھول جایا کرتا تھا اور یہ خیال بھی نہ رہتا تھا کہ مجھے کسی سے محبت ہے۔ لیکن حسینی اس مرتبہ تو حالت یہ ہے کہ مجھے شراب ہی اچھی نہیں لگتی بطور اس زمانہ میں دو ایک مرتبہ زبردستی میں نے پی بھی، تو غم غلط ہونے کی بجائے کچھ اور بھی بڑھ گیا۔ اور تمام وقت روتے ہی گذرا۔ میں تم سے سچ کہدوں کہ اس دفعہ میرا دل یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس کام میں تم سے مدد لی جائے۔ اور تمہیں ان حالات کی خبر کی جائے۔ آج سولھواں دن ہے جب میں نے اسے محض ایک اتفاق کی بدولت دیکھا تھا اور مشکل سے سولہ دن کے بعد آج تم سے کہا ہے، اور وہ بھی خود نہیں بلکہ تمہارے پوچھنے پر حسینی۔" اے ہے حضور! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں ایسی باتیں مردوں کو زیب نہیں دیتیں۔ بھلا کوئی عورتوں کا بھی اتنا خیال کرتا ہے۔ عورت تو مرد کے پاؤں کی جوتی ہوتی ہے۔ جب چاہا پہن لی جب چاہا اُتار کے پھینکدی۔"

ممتاز۔" ہاں چند روز پیشتر تک تو میرا بھی یہی خیال تھا لیکن اب نہیں، اب تو میرے دل کی حالت ہی عجیب ہو گئی ہے۔ مجھے پہلی مرتبہ اب معلوم ہوا ہے کہ محبت کیا چیز ہوتی ہے۔ دوسری عورتوں کی طرح اس مرتبہ میرے دل میں یہ خواہش نہیں ہے کہ وہ مجھے مل جائے۔ بلکہ اب تو یہ آرزو ہے کہ میں اس کے قدموں میں اپنی جان دیدوں۔ تمہیں خوب معلوم ہے کہ عورتوں کے ساتھ دھوکا یا جبر اور زبردستی کرنے میں کبھی مجھے ذرا سا بھی تامل نہ ہوتا تھا۔ لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اب اس قسم کا خیال بھی میرے دل میں نہیں آسکتا

تم نے خود بھی شاید کسی سے محبت نہیں کی ہے۔ اس لئے تمہاری سمجھ میں میری یہ حالت نہ آئیگی۔ لیکن اب میں خوب سمجھ گیا ہوں اور اس سولہ دن کے عرصہ میں جو لطف میں نے اُٹھائے ہیں وہ تمام عمر کبھی نہ اُٹھائے تھے"۔

حسینی:"اس کا نام لطف ہے کہ آپ رات دن تڑپتے ہیں لطف تو جب تھا کہ جس سے آپ کو محبت ہے وہ آپ کے پاس ہوتی"۔

ممتاز:-"ہاں جی تو یہی چاہتا ہے کہ وہ ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہے۔ مگر ہر وقت اس کے خیال میں محو رہنا بھی کچھ کم پُر لطف نہیں ہے"۔

حسینی:-"بہت اچھا، اب میں جاتی ہوں، اور کوشش کروں گی کہ جس طرح بھی ہو اسے لاکر آپ کے پاس بٹھا دوں، مگر بڑا مشکل کام ہے۔ اول تو یہ کہ وہ شادی شدہ عورت ہے۔ اور پھر یہ کہ عورت بھی کسی معمولی گھر کی نہیں ہے میں اسے جانتی ہوں بڑی نیک اور اچھی عورت ہے۔

ممتاز:"ہاں جاؤ اور جس قدر کوشش ہو سکے کرو"۔

حسینی:"اتنے بڑے کام کا انعام بھی حضور سے بڑا ہی لونگی۔

ممتاز:"اس کا ذکر ہی فضول ہے۔ جس کے لئے میں اپنی جان تک دے سکتا ہوں اس کے لئے روپیہ خرچ کرنے میں مجھے دریغ نہیں ہو سکتا"۔

منیرہ کا گھر اگرچہ بہت بڑا اور شاندار نہ تھا، لیکن چونکہ اسے اپنے مکان کی آراستگی اور صفائی کا حد سے زیادہ خیال رہتا تھا۔ اس لئے وہ اپنا تمام وقت جو بچے کی پرورش سے بچتا تھا جھاڑ پونچھ ہی پر صرف کیا کرتی تھی اور محض اپنی محنت

اور سلیقہ مندی سے اس نے معمولی سے مکان کو بالکل ایک دلہن بنا رکھا تھا۔ کئی روز سے حسینی نے اس کے گھر آنا جانا شروع کیا تھا، اور پانچ سات روز کی ملاقاتوں میں منیرہ کے دل میں اچھی خاصی جگہ کر لی تھی۔ اس نے منیرہ پر یہ ظاہر کیا تھا کہ وہ کعبۃ اللہ کے حج سے فارغ ہو کر ابھی واپس آئی ہے اور یہ کہ اس کی ایک جوان لڑکی جو اس کے ساتھ حج کو گئی تھی وہیں مکہ معظمہ میں مر گئی۔ منیرہ کو یہ بھی بتایا گیا تھا کہ اس لڑکی کی شکل وصورت منیرہ سے بہت ملتی جلتی تھی، اس لئے حسینی کو منیرہ کے ساتھ غیر معمولی محبت ہو گئی تھی۔ دنیا کے مکر وفریب سے ناواقف منیرہ نے اس تمام داستان کو سچ سمجھ کر اس پر یقین کر لیا۔ اور اسے حسینی سے بہت کافی ہمدردی پیدا ہو گئی حسینی کی باتیں چھوٹے چھوٹے تھے اور حسب موقع پند گانہ نصیحتیں سب ایسی چیزیں تھیں کہ ایک اچھی خاصی چالاک اور تجربہ کار عورت بھی دھوکے میں آجاتی نہ کہ غریب منیرہ جو بالکل ہی الھڑ اور نوجوان تھی۔ جسے دنیا کا ذرا سا بھی تجربہ نہ تھا۔ اس نے حسینی پر پورے طور سے اعتبار کر لیا اور اسے بالکل اپنی ماں کی جگہ سمجھنے لگی۔ حسینی نے منیرہ کے بچے کو بھی خوب ہلا لیا۔ یہاں تک کہ جتنی دیر وہ گھر میں رہتی حمید ماں کے پاس بھی نہ جاتا تھا اور اسی کی گود میں کھیلتا رہتا تھا

باتوں ہی باتوں میں حسینی یہ معلوم کر چکی تھی کہ منیرہ کا خاوند عرصہ دراز سے گھر نہیں آیا ہے۔ اور منیرہ رشید سے کسی قدر ناراض تو پہلے ہی تھی۔ اب حسینی کی باتوں نے اسے اور بھی بیزار کر دیا تھا۔ اور وہ رشید کو ظالم اور اپنے آپ کو مظلوم خیال کرنے لگی تھی۔ ایک روز حسینی نے منیرہ کے گھر آتے ہی کہا:۔

" منیرہ بیٹی آج میرا دل تمہارے لئے بہت کڑھا۔ ہمارے پڑوس میں محمود

کی ماں رہتی ہیں۔ ان کے میاں بھی بہت دنوں سے پردیس گئے ہوئے تھے وہ آج صبح آئے ہیں۔ سارے گھر میں ایسی خوشی ہو رہی ہے کہ جیسے عید ہو گئی ہو۔ ذرا سی بچی محمودہ کبھی باپ کی ٹانگوں سے چمٹتی ہے اور کبھی دوڑ کے ماں کی گود میں چڑھ جاتی ہے۔ محمودہ کی ماں کا چہرہ خوشی سے دمک رہا ہے اور گھر میں بھی ایسی چہل پہل ہے کہ کچھ کہا نہیں جاتا۔ مجھے اس وقت سے برابر یہی خیال لگا ہوا ہے کہ اسی طرح تمہارے میاں بھی آجاتے تو تمہارے گھر میں بھی عید ہوتی اور تمہارا یہ روز روز کا غم جاتا۔ ہائے۔ بچی کیسی گھل گھل کر تباہ ہوئی جا رہی ہے۔ یہ جوانی دیکھو اور اس پر یہ دن رات کا جلنا! اللہ نہ کرے کہ کسی کا خاوند ایسا بے پرواہ ہو، جیسا کہ تمہارا ہے۔ تمہیں ایسی نیک ہو کہ ابتک اس کے نام پر بیٹھی ہوئی ہو کوئی اور ہوتی تو خدا جانے ابتک کیا کچھ کر گذرتی۔"

منیرہ۔ "اماں بھلا میرے ایسے نصیب کہاں کہ وہ آجائیں! میرے گھر میں تو عید کے دن بھی محرم ہی رہتا ہے۔ مگر اب میں سچ کہدوں کہ مجھے بھی کچھ زیادہ فکر نہیں ہے: وہ آتے آئیں نہ آتے نہ آئیں۔ میں تو ارادہ کر چکی ہوں کہ اب اگر میرا دم بھی نکلتا ہوگا، تو انہیں خبر نہیں کرونگی۔"

حسینی "بیٹی تم نے کبھی کوئی گنڈہ تعویذ بھی کرایا؟ زیب النساء کا میاں اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا اور دن رات آزاریوں بازاریوں میں پڑا رہتا تھا شاہ صاحب نے اسے کچھ تعویذ دیئے۔ اور اسی کے گھر بیٹھ کے کچھ ختم پڑھا تم جانو۔ اللہ کے نام میں بڑی قدرت ہے۔ اکیسویں دن اسی مردوے کا یہ حال تھا کہ بیوی کے قدموں میں لوٹتا تھا۔

منیرہ: "اماں میں کس سے تعویذ گنڈا کراتی۔ میرا کون بیٹھا ہے جو کسی مُلا سیانے کے پاس جائے۔"

حسینی: "اے ہے یہ بھی نگوڑا کوئی کام ہے۔ میں آج ہی اپنی بچی کے لئے شاہ صاحب کی خدمت میں جاؤنگی، میں نے انہیں دیکھا ہے۔ ابھی بالکل جوان ہیں اور بڑے خوبصورت ہیں۔ چہرے پر نور برستا ہے۔ مگر وہ تو اسی گھر میں بیٹھ کر ختم پڑھیں گے۔"

منیرہ: "یہ تو کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔"

حسینی: "اے ہے بیٹی! تم نے بھی بھلا فکر کیا۔ ایسے اللہ والے لوگوں سے کاہے کا پردہ اور کیسی شرم؟ ان کے سامنے تو کوئی ننگا کھلا بھی پھر تا رہے تو کچھ حرج نہیں ہے۔ انہیں تو سارا زمانہ جانتا ہے۔ بمبئی بھر میں ان کی بزرگی اور پارسائی مشہور ہے۔ بڑے پہنچے ہوئے فقیر ہیں۔ ایسے نیک لوگ اس زمانہ میں پیدا کہاں ہوتے ہیں۔"

منیرہ: "وہ کتنی دیر تک ختم پڑھا کریں گے؟"

حسینی: "زیب النساء کے گھر تو وہ مغرب کی نماز پڑھ کے جاتے تھے اور عشا کے وقت لوٹا کرتے تھے۔"

منیرہ: "تو اُن کے گھر میں تو اور بھی عورتیں ہوں گی۔ میں تو بالکل اکیلی ہوں۔"

حسینی: (ہنسکر) "اکیلی دکیلی کا کیا ذکر ہے۔ تم دنیا داروں کے خیالات ہمیشہ بُرائی کی طرف جاتے ہیں۔"

منیرہ: "اگر روز تم بھی شام کو آجایا کرو۔ اور ان کے جانے کے وقت تک یہیں

ٹھہر اکرو تو خیر بلا سے یہ ایک کوشش باقی رہ گئی تھی، میں یہ بھی کر دیکھونگی۔
اگر تم نہیں آسکتیں، تو میں اکیلے گھر میں تو انہیں نہیں بلاؤنگی۔"

حسینی۔" اچھا بیٹی میں بھی آجایا کرونگی۔ اللہ وہ دن کرے کہ تمہاری مراد
تو کسی طرح پوری ہو۔ مجھے تو رہ رہ کے تمہاری جوانی پر ترس آتا ہے۔

حسین و نازنین منیرہ ساری سے اپنا تمام جسم اچھی طرح چھپائے
کسی قدر شرمائی لجائی، اور خوب سمٹی سمٹائی ایک کرسی پر بیٹھی ہے۔ اس
کے قریب فرش پر حسینی بیٹھی ہوئی نوجوان ممتاز سے کچھ باتیں کر رہی ہے جو
اس وقت گیروا کپڑے پہنے ایک آرام کرسی پر لیٹا ہے اور بہت ہی للچائی ہوئی
نظروں سے منیرہ کے زاہد فریب حسن کو دیکھ رہا ہے۔ حسینی بہترا چاہتی ہے
کہ ممتاز نے جو روپ بھرا ہے اسے اچھی طرح نباہ دے۔ اور گنڈے تعویذ
کرنے والے فقیروں کی طرح باتیں بنا کر منیرہ کے دل میں ختم پڑھوانے کا
اشتیاق دوبالا کردے۔ لیکن وہ کچھ ایسا کھویا سا ہے کہ اسے یہ بھی خبر نہیں ہے
کہ وہ کہاں ہے۔ اور کیوں آیا ہے۔ بار بار اس کا دل چاہتا ہے کہ دوڑ کر منیرہ
کے قدموں پر سر رکھ دے اور اپنے دل کی حالت سچ سچ بیان کردے لیکن
انتہائی محویت اسے ایسا کر گذرنے سے باز رکھتی ہے۔ اور وہ بالکل مبہوت
بنا ہوا اس چشمۂ حسن و رعنائی کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے۔ جو اس
وقت ایک نسوانی صورت میں، اس کے سامنے جلوہ گر ہے۔

حسینی کی متواتر کوششوں پر اُسے بہت دیر کے بعد ہوش آیا اور اب

اس نے سنبھل کر گفتگو شروع کی۔
"تو بچہ تمہارا آدمی کہاں ہے؟" اس نے رُک رُک کر منیرہ سے کہا اور جب جواب دینے کے لئے منیرہ نے اپنا رُخ اس کی طرف پھیرا تو وہ تاب نظارہ نہ لاسکا۔ اور اس کی آنکھیں نیچے کو جھک گئیں۔
منیرہ۔ "جی وہ برما میں ہیں۔"
ممتاز۔ "کتنے دن سے گھر نہیں آئے؟"
منیرہ۔ "اب تک کوئی ڈھائی برس کے قریب ہو چکے ہیں۔"
ممتاز۔ "ڈھائی برس سے! اُفوہ! کوئی بڑا ہی سنگدل آدمی ہے جو شخص دنیا کی حوروں کی قدر نہیں کرتا۔ اسے خدا جنت کی حوریں بھی نہ دیگا۔"
منیرہ۔ شرما کر خاموش ہو گئی اور شاہ صاحب نے پھر فرمایا۔
"اچھا تو بچہ یہاں ایک چھوٹی سی چوکی کی ضرورت ہو گی، جس پر بیٹھ کر فقیر اللہ کا نام پڑھ سکے۔ خدا میں سب قدرت ہے۔ اس کے نام میں بڑی برکت ہے۔ تم نااُمید مت ہو۔ نااُمید ہونا کفر ہے۔ اس مالک کی ذات پر بھروسا رکھو وہ سب کام درست کر دیگا۔"
منیرہ۔ "اب آپ نے مدد کے لئے ہاتھ بڑھایا ہے تو خدا چاہے سب کام ٹھیک ہی ہو گا۔ بزرگوں کی دعا میں بڑا اثر ہوتا ہے۔"
حسینی۔ "شاہ صاحب انہیں وہ تعویذ بھی تو دیدیجئے، جو آپ نے زیب النسا کو دیا تھا۔"
ممتاز۔ "اچھا بھائی اچھا۔ وہ تعویذ بھی لکھ دیں گے۔ مگر اس کے لکھنے کے لئے

تو بہت جھگڑا کرنا پڑتا ہے۔ روز رات کو سمندر کے کنارے جاکر کمر کمر پانی میں کئی کئی گھنٹے کھڑا ہونا پڑیگا۔ تب کہیں وہ عمل پورا ہوگا اور تعویذ لکھا جائیگا"
منیرہ (بڑی لجاجت کے ساتھ) "نہیں شاہ صاحب اب حضور نے توجہ کی ہے تو پوری کیجئے۔ بیشک آپ کو بڑی تکلیف ہوگی۔ لیکن ایک غریب دکھیاری کا کام نکل جائے گا"
منیرہ۔ نے یہ فقرے کچھ اس ادا سے کہے کہ ممتاز بیتاب ہوگیا اور اپنی تمام قوت ضبط صرف کرکے بمشکل تمام وہ اس بات سے باز رہ سکا کہ منیرہ کو اپنی طرف کھینچکر سینہ سے لگائے۔

دوسرے روز آنے اور ختم شروع کردینے کا وعدہ کرکے شاہ صاحب رخصت ہوئے اور منیرہ لیٹ کر صورت حالات پر غور کرنے لگی۔
"میرا جی تو نہیں چاہتا کہ انہیں بلانے کی ذرا سی بھی کوشش کروں۔ جب انہیں مجھ سے محبت ہی نہیں ہے، تو پھر میں کیوں زبردستی ان کے گلے پڑوں۔ وہ یہاں اگر تعویذوں اور عملوں کے زور سے آبھی گئے تو کیا فائدہ ہوگا؟ ان کا دل تو برما کے روپیوں میں پڑا ہوگا۔ اور تعجب نہیں کہ دوسرے ہی دن وہ پھر چل دیں۔ خدا بخشے ابا جان نے تو بہت کچھ دیکھ بھال کے ان کے ساتھ میری شادی کی تھی۔ مگر انہیں یہ کیا خبر تھی کہ ان کے دل میں روپیہ کے سوا کسی اور چیز کی محبت پیدا ہی نہیں ہوسکتی۔ آدمی کا ظاہر ہی دیکھا جاتا ہے۔ ظاہر میں ان کے اندر کوئی بھی بُرائی نہیں ہے۔ صورت شکل اچھا خا..
.... صورت شاہ صاحب کی بہت اچھی ہے۔ امان سچ

کہتی تھیں کہ ان کے چہرہ سے نور برستا ہے۔ عمر بھی کچھ زیادہ نہیں ہے
بہت سے بہت کوئی پچیس چھبیس برس کی ہوگی۔ خدا جانے ایسی جوانی میں
کیوں فقیری لے لی۔ باتوں سے کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کچھ دل دکھا ہوا ہو
جتنی دیر بیٹھے کچھ کھوئے ہوئے سے رہے۔ اور ہاں ایک دفعہ میں نے دیکھا تھا کہ مجھے
بھی کچھ بہت گھور گھور کے دیکھ رہے تھے۔ خیر خدا جانے کیوں۔ اس گنڈے تعویذ
پر مجھے کبھی اعتقاد نہیں ہوا۔ اماں کے خیال سے میں راضی ہو گئی۔ وہ کہتی تھیں
کہ میں نے ایک ترکیب بتائی، اور یہ کرتی نہیں بھلا تعویذ سے اور ختم سے کیا
ہوتا ہے؟ ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ برما میں بیٹھے ہیں اور شاہ صاحب
یہاں سے انہیں بیٹھے بیٹھے کھینچ لیں گے؟ ویسے شاہ صاحب طاقتور تو ہیں
اگر وہ سامنے ہوتے، تو ان کا ہاتھ پکڑ کر شاید کھینچ ہی لیتے، یہ شاہ صاحب
ہیں کون؟ سنا ہے کبھی کسی سے کچھ لیتے بھی نہیں۔ پھر کھاتے کہاں سے ہیں؟
گھر کے رئیس ہوں گے۔ .... اے ہے ننھا اٹھ بیٹھا آج خدا جانے
کیوں اسے بخار آگیا ہے۔
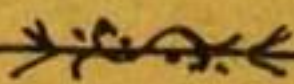
دوسرے دن سے شاہ صاحب یعنی ممتاز نے مغرب اور عشا کے درمیان
ختم پڑھنے کی غرض سے آنا شروع کر دیا۔ اور آہستہ آہستہ دو تین روز میں میرہ
کی جھجھک اور وحشت میں بھی کمی آگئی۔ شروع شروع کے تین چار روز تو حسینی
نہایت پابندی کے ساتھ مغرب سے کچھ پیشتر ہی میرہ کے گھر آتی اور ممتاز
کے ہمراہ واپس جاتی رہی، لیکن جب اس نے اطمینان کر لیا کہ میرہ کی نامانوسی

اب کم ہوگئی ہے۔ تو اس نے یہ وطیرہ اختیار کیا کہ کبھی ذرا دیر لگا کر آئی، کبھی وظیفہ ختم ہونے سے پہلے ہی کسی بہانہ سے چلدی اور کسی روز بیماری کا عذر کر کے بالکل ہی نہ آئی۔ اور منیرہ اور ممتاز تمام وقت بالکل اکیلے اس مکان میں رہے،

معمولی حالات میں تو ایسے موقعوں پر ممتاز کا طرز عمل ضرور یہی ہوتا کہ وہ منیرہ کو تنہا پاکر اس اتفاق سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا لیکن منیرہ سے اسے حقیقتاً محبت ہوگئی تھی اور اس نے اپنی طبیعت کی حالت کے متعلق جو کچھ حسینی سے کہا تھا اس میں ذرا سا بھی مبالغہ نہ تھا بالکل آزاد منش اور سخت آوارہ و عیاش ہونے کے باوجود اس کی یہ حالت تھی کہ اس طرح منیرہ کے ساتھ تنہا چھوڑ دیا جانا آج اُسے خود بھی کچھ ناگوار سا تھا۔ اور گو اس نے خود ہی حسینی کو آج آنے سے منع کر دیا تھا، لیکن اب اس کی دلی تمنا یہی تھی کہ وہ آجاتی وہ منیرہ کے حسن سے اس قدر مرعوب تھا کہ اس سے گفتگو کرتے وقت اس کی زبان لڑکھڑانے لگتی تھی اور ہاتھ پاؤں میں رعشہ آجاتا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ آج منیرہ پر اپنی دلی حالت کا اظہار کر دے۔ کیونکہ اب اسے ختم پڑھتے دس روز گذر چکے تھے۔ اور اتنے عرصہ میں منیرہ اس سے اچھی خاصی مانوس ہو چکی تھی۔ لیکن موقع ملنے کے باوجود وہ بار بار ہمت کرتا تھا اور رہجاتا تھا۔ اس کی یہ شش و پنج کی حالت منیرہ سے چھپی نہ رہ سکی اور اس نے اچھی طرح محسوس کر لیا کہ شاہ صاحب کا حال آج کچھ غیر ہے۔ ممتاز کی زبان کسی طرح نہ کھل سکی اور وظیفہ ختم کر کے آج بھی وہ روزمرہ ہی کی طرح رخصت ہو گیا۔ لیکن آج اس کی نگاہوں نے زبان کا کام انجام دیدیا تھا۔ اور منیرہ جسے

شک تو کسی قدر پہلے ہی سے تھا۔ آج اس کی حالت سے پورے طور پر خبردار ہوگئی تھی۔

اسے ممتاز کی یہ کمزوری اچھی نہ معلوم ہوئی۔ اور کسی قدر مسکرا کر اس نے اپنے دل سے کہا کہ شاہ صاحب نے دنیا پورے طور پر چھوڑی نہیں ہے آج ان کی نگاہیں مجھ پر کچھ اچھی نہیں پڑ رہی تھیں۔ اور یہ انہیں اماں کو کیا سوجھی کہ بالکل آئی ہی نہیں۔ میرا دل کیسا ڈر رہا تھا۔ مگر نہیں، شاہ صاحب ہیں بڑے شریف آدمی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے تھے۔ مگر ان بیچاروں کی آخر تک کسی طرح ہمت ہی نہ پڑی تھی (آئینہ میں اپنی صورت دیکھ کر) کیا خدا کی شان ہے کہ غیروں کو تو میری صورت اچھی معلوم ہوتی ہے اور جسے اچھی معلوم ہونی چاہیے تھی، اسے مجھ سے نفرت ہے۔ آدھا وظیفہ تو ہوگیا کیا کچھ اثر ہوا ہوگا؟ مجھے تو اب بھی اعتبار نہیں آتا۔ اور میں نے تو محض اماں کے کہنے سے اتنا جھگڑا کیا ہے۔ نہیں تو میری طرف سے وہ آئیں یا نہ آئیں۔ جب انہیں مجھ سے نفرت ہے تو میں بھی خواہ مخواہ گلے کا ہار کیوں بنوں اگر اس طرح وظیفہ کے زور سے وہ آ بھی گئے تو اس سے میرے دل کو کیا اطمینان ہوگا، مجھے تو خوشی اسی وقت ہو سکتی تھی کہ جب وہ میری محبت سے مجبور ہو کر آتے۔ جادو ٹونے کے اثر سے آئے تو مجھ پر کیا احسان ہے میرے خیال میں اماں ٹھیک ہی کہتی تھیں کہ انہیں وہاں کسی سے محبت ہوگئی ہے۔ نہیں تو بھلا ایسا ہو سکتا تھا کہ میرے خطوں کا جواب تک نہ

دیتے۔ (کسی قدر غصّے کی علامتیں چہرے پر نمودار ہوتی ہیں) ضرور یہی بات ہے۔ میں ہی بیوقوف تھی کہ میں نے اب تک اُن پر ایسا شک نہیں کیا۔ ان مردوُں کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ ظاہر میں کیسے سید ھے اور نیک ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ جانتے ہی نہیں خیر! مجھ غریب کا دِل جلایا ہے۔ تو ان کا دل بھی تو ٹھنڈا نہیں رہیگا۔ افوہ! ان مردوں کی چالاکیوں کی بھی کوئی حد ہے؟ اب انہیں شاہ صاحب ہی کو دیکھو نا! ایسے اللہ والے۔ ایسے نیک۔ ایسے متقی پرہیزگار، مگر آج ان کی نگاہیں بھی بدلی ہوئی تھیں۔ وہ تو یہ کہو کہ بیچارے بہت شریف اور نیک آدمی ہیں اس لئے انہیں اپنے دل پر قابو ہے۔ اگر اتنے پرہیزگار نہ ہوتے تو ضرور آج ساری قلعی کھُل جاتی۔ توبہ! توبہ! اگر کہیں خدانخواستہ ان کی نیت میں فتور آجاتا تو میں کیا کرتی؟ آج مجھے یہ ہو کیا گیا ہے۔ کیوں ایسے بڑے بُرے خیال دل میں آرہے ہیں۔ اے ہے ننھا مُٹھا آج بھوکا ہی سو گیا تھا
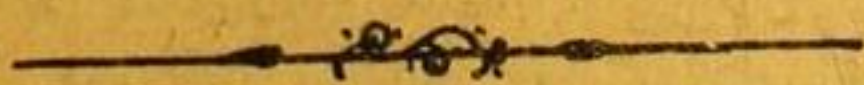
ختم بدستور جاری رہا اور حسینی کی حاضری کی بے قاعدگیاں بھی پندرہ روز گذر چکے لیکن انتہائی خواہش اور کوشش کے باوجود ممتاز کی زبان نہ کھلنی تھی نہ کھلی وہ برابر ایک ساٹکٹکی باندھے منیرہ کو دیکھتا تو رہتا تھا اور اس کے اس انداز سے ایک بیوقوف شخص بھی سمجھ سکتا تھا کہ اس کا دل منیرہ کی محبت سے لبریز ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ کسی اور طرز پر اظہار عشق کی اسے کبھی جرأت نہ ہوئی۔

منیرہ اس کے دلی جذبات سے بہت اچھی طرح خبردار ہو چکی تھی اور اب اسے ڈرنے یا گھبرانے کی بجائے اُسے اپنے حُسن کی کرشمہ سازیاں دیکھنے میں لطف آنے لگا تھا۔ یہی نہیں بلکہ ممتاز کا ضبط دیکھ کر اس کے دل میں ایک خفیف سی ہمدردی بھی پیدا ہو چلی تھی۔ جب وہ یہ دیکھتی تھی کہ کامل تنہائی میسر ہونے کے باوجود شاہ صاحب کبھی اس سے کچھ نہیں کہتے اور اپنے دل کو پورے طور پر اپنے قابو میں رکھتے ہیں، تو شاہ صاحب کی عزت اس کی نگاہوں میں ہو جاتی تھی۔ اور کبھی کبھی اس کے ہمدردانہ خیالات اس حد تک بھی پہنچ جاتے تھے کہ اگر میری شادی ہو نہ چکی ہوتی تو یقیناً شاہ صاحب اس قابل تھے کہ انہی کو انتخاب کیا جاتا۔ اپنے دل کی عمیق ترین خلوت میں کبھی کبھی اُسے ایسا بھی معلوم ہوتا تھا کہ شاہ صاحب کے متعلق کچھ محبت کے سے جذبات بھی دبے اور چھپے پڑے ہیں۔ لیکن یہ خیال آتے ہی وہ کانپ اُٹھتی تھی اور کبھی اتنی ہمت نہ کرتی تھی کہ ذرا اچھی طرح ان کی جانچ پڑتال کرے۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس قسم کی محبت مذہب کے نزدیک بھی مذموم ہے۔ اور دنیا کے نزدیک بھی۔ اس لئے اگر ایسے کچھ جذبات ناخواستہ طور پر دل میں پیدا بھی ہو چکے ہیں۔ تو ان کے لئے یہی بہتر ہے کہ جہاں ہیں وہیں دبے پڑے رہیں۔ اور کبھی اوپر کی سطح پر نہ آئیں۔

ختم کو شروع ہوئے آج پندرہویں شب تھی اور آج پھر حسینی کی غیر حاضری نے ممتاز کی جان پر بنا دی تھی۔ ہر دو دو چار چار منٹ کے بعد

اس کے دل میں اظہارِ محبت کی تمنّا پیدا ہوتی تھی۔ بعض ابتدائی الفاظ زبان تک آتے تھے، لیکن فوراً ہی دل کی دھڑکن ہونٹوں کو اس قدر خشک کر دیتی تھی کہ وہ کسی طرح نہ کھلتے تھے۔ اور زبان تک آئے ہوئے دلی جذبات اسی طرح اُلٹے پاؤں لوٹ جاتے تھے۔ اور وہ پھر اسی طرح محوِ نظارہ ہو جاتا۔

انہی حالات میں وظیفہ ختم ہوا۔ اگرچہ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ وہ ختم ہوا۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ کبھی شروع ہی نہ ہوا تھا۔ ممتاز بادلِ ناخواستہ اپنی جگہ سے اُٹھا۔ لڑکھڑاتے ہوئے پیروں سے وہ چوکی سے نیچے اُترا اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی تسبیح اور اپنا عصا اُٹھانے کی کوشش کی۔ منیرہ بھی اپنی کرسی سے اسے رخصت کرنے کے لئے اُٹھ چکی تھی۔ اور جب ممتاز کے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے عصا نہ سنبھل سکا اور گر گیا تو منیرہ نے آگے بڑھ کر جلدی سے وہ عصا اُٹھا لیا اور ممتاز کو دیا عصا دینے اور عصا لینے میں محض اتفاقاً منیرہ کا نرم اور نازک ہاتھ ممتاز کے ہاتھ سے چھو گیا..........

نسوانی ہاتھ کی نرمی گرمی اور گداختگی ایک بجلی کی لہر تھی جو ممتاز کے رگ و پے میں سرایت کر گئی، وہ ساری مرعوبیت اور وہ تمام ضبط ایک تودۂ بارود تھا۔ جس میں آگ لگ گئی۔ بے تاب بے قرار اور از خود رفتہ ہو کر اس نے ایک عالمِ بے اختیاری میں منیرہ کو اپنی طرف کھینچ کر سینہ سے لگا لیا اور منہ پر منہ رکھ دیا ایک یا زیادہ سے زیادہ دو لمحوں تک منیرہ نے بھی

کوئی مزاحمت نہ کی۔ اور شاید ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بالآخر اس کے دل کے چھپے ہوئے جذبات بھی بالائی سطح پر آ گئے ہیں۔ ننھے کے رونے کی آواز نے منیرہ کو ہوشیار کیا۔ اور وہ ممتاز کی گرفت سے خود کو آزاد کر کے ننھے کے کھٹولے کی طرف بھاگی۔ سوتے میں کسی چیز سے ڈر کر اس نے ایک چیخ ماری تھی اور پھر باطمینان تمام سو گیا تھا۔ اس کا بھولا بھولا معصوم چہرہ۔ اس کے جھنڈولے بال اور اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ کچھ ایسی دلکش چیزیں تھیں اور بجلی کی تیز روشنی میں ان کی دلفریبی کچھ اس قدر بڑھ گئی تھی کہ منیرہ بیتاب ہو کر جھکی کہ اپنے لاڈلے کو پیار کرنے
ننھے کے ہونٹ ابھی کوئی چار انچ کے فاصلے پر تھے کہ یکایک منیرہ کو اس بوسے کا خیال آیا جو ابھی ابھی ممتاز نے اس کے ہونٹوں پر دیا تھا اس کا دل کانپ گیا۔ اس کی روح لرز گئی۔ اور بے اختیار اس کی زبان سے نکلا:۔

"میرے ناپاک اور نجس ہونٹ ہرگز اس لائق نہیں کہ اس معصوم فرشتے کا بوسہ لیں۔ میں ذلیل اور گندی عورت کیا اب اس قابل ہوں کہ اس فرشتے کو دودھ پلاؤں۔ جس کی یہ امانت ہے۔ میں نے اس کے ساتھ دغا کی! اب میں انہیں کیا منہ دکھاؤں گی۔ ننھا ضرور میری ہی کمزوری پر مسکرا رہا ہے۔ ہاں ہاں وہ فرشتہ ہے۔ اسے سب خبر ہے۔ اس نے سب کچھ دیکھا ہے ہائے! اب میں کس منہ سے اسے اپنا بچہ کہوں؟ خدا اس شاہ صاحب کا ناس کرے۔ جس نے میرے ہونٹ گندے کر دیئے۔ یہ شاہ صاحب نہیں

شیطان ہے۔ اچھا! خدا تو اس کا ناس کرے گا یا نہ کرے گا، میں خود ہی کیوں نہ مزہ چکھا دوں۔ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ وہ اُٹھی۔ اپنے تکیہ کے نیچے سے چھری نکالی اور ممتاز کی طرف دوڑی۔

ممتاز سب کچھ سُن چکا تھا اور اب اسے بھی پورے طور پر ہوش آ گیا تھا۔ چُھری دیکھتے ہی وہ سیدھا دروازہ کی طرف بھاگا اور ایک جست میں نکل گیا۔

منیرہ جب دروازے سے ناکام لوٹی تو اس نے ارادہ کیا کہ اسی چھری سے اپنا کام تمام کرے۔ اسے واقعی اپنے وجود سے نفرت ہو گئی تھی اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ زمین پر ایک ایسے ناپاک جسم کا بوجھ باقی رکھا جائے۔ اس نے کلمہ پڑھ کر اپنا وہ ہاتھ بلند کیا کہ جس میں چھری تھی اتنے میں پھر ننھے نے ڈر کر ایک چیخ ماری اور رونا شروع کر دیا۔ اُٹھا ہوا ہاتھ مفلوج ہو کر نیچے گر گیا۔ چھری پھینک دی گئی اور "میرا فرشتہ" "میرا بچہ" "میرا لال" کہتی ہوئی منیرا جھکی اور ننھے کو کلیجے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

وداعِ راشدؒ

حیاتِ راشدؒ کا آخری باب

از۔ رازق الخیری

حضرت علامہ راشد الخیریؒ کی علالت اور وفات کے حالات ذاتی اوصاف اور مختلف انسانی حیثیتوں کا تذکرہ حضرت مولانا عبدالماجد کی رائے "درد صفحہ صفحہ میں سطر سطر میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ آخر دم کی ساری تفصیلات کا نقشہ نظر کے سامنے آجانیکے بعد کون ایسا سنگدل ہو جس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نہ جاری ہو جائیں گے؟ اردو ٹریجڈی کے بادشاہ کی کتاب زندگی کا خاتمہ یوں ہی ہونا بھی چاہیے تھا کہ وہ ایک ٹریجڈی کا تحفہ دنیا کو دے جائیں۔" صدق لکھنؤ۔

"مولانا رازق الخیری نے اپنے عظیم المرتبت والد کا اچھوتا طرز تحریر گویا ورثہ میں پایا ہے۔ جملہ حالات اس قدر مفصل موثر لکھے ہیں کہ پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے سینما فلم کی طرح نظر آتے ہیں۔ حزن نگاری کے بادشاہ کے آخری وقت کا بیان نہایت ہی رقت انگیز ہے۔" ساقی دہلی۔

"رازق الخیری صاحب نے دلی کی صاف ستھری اور آسان زبان میں سچے پاکیزہ جذبات کی دردناک تصویر کھینچ کر رکھدی ہے واقعات کو اس قدر دلدوز اور موثر انداز میں بیان کیا ہے کہ بے اختیار آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں۔" شاہکار۔ لاہور۔

"ہندوستان کے سب سے بڑے حزن نگار کی موت کے تاثرات کو اس
میں بیان کیا گیا ہے گویا خود مولانا مرحوم اس کتاب کے مصنف ہیں۔" اخبا

۸۰ صفحات   ۳ فوٹو   قیم

ملنے کا پتہ:۔ دفتر عصمت دہلی